قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا ستترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

نومبر 2020ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

ترجمہ: اکثر شاعر اپنے مرنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ہماری آنکھیں کھول دیں۔

(تمہید، اسرارِ خودی، اقبالؔ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

نومبر 2020ء

جلد 73 شمارہ نمبر 11

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: اس چمن میں آشیاں تیرا بھی ہے میرا بھی ہے	ادارہ	4
اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی	غلام احمد پرویزؒ	5
علامہ اقبالؒ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں	مولانا حافظ غلام مرشد مرحوم	23
خصوصی درس: عَبَسَ وَتَوَلّٰی	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	36
تصوّف جس کے سارے عقائد قرآن کے خلاف ہیں	خواجہ ازہر عباس، کراچی	50
بچوں کا صفحہ: وعدہ پورا کرو	ادارہ	58

قائم مقام چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Tolue Islam, Quran and Hadeeth
Dr Ejaz Rasool, UK — 60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: محمد اکرم راٹھور

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اس چمن میں آشیاں تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

''اَرے یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کشتی میں چھید کیوں کر رہے ہو؟

کشی میں چھید کیوں کرتا ہوں؟ پچاس دفعہ اس ملاح سے کہہ چکا ہوں کہ تم نے بادبان غلط باندھا ہے۔ کشتی سمتِ ساحل نہیں جا رہی۔ اس کا رُخ سیدھا کرو لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔ اب جو کشتی بیکار ہو گی تو پتہ چلے گا!

ارے پاگل! کشتی میں چھید کرو گے تو کشتی کے ساتھ خود بھی ڈوبو گے۔ ملاح کو تنبیہہ کا یہ کونسا طریق ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ناخدائی جانتا ہے تو ملاح کے ہاتھ سے چپو لے لو اور کشتی کا رخ سیدھا کر دو لیکن کشتی کو سلامت رکھو کہ اس کی سلامتی خود تمہاری سلامتی ہے۔''

سرزمینِ پاکستان وہ سرزمین ہے جسے قانونِ خداوندی/قرآنِ کریم کے نفاذ کا مملکتِ مدینہ کے بعد اولین معمل بننا تھا۔ اس خطۂ زمین کو اس لئے بھی محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس میں قرآنی نظام کی تشکیل کی جائے گی۔ ہماری ان پاکستانی بھائیوں سے استدعا ہے جو کہ پاکستان دشمن عناصر کے ایجنٹوں کے ساتھ مل کر، افواجِ پاکستان اور مملکتِ پاکستان سے مزاحم ہیں کہ خدارا! ؎

دیکھ لو اچھی نہیں ہے بجلیوں سے سازباز
اس چمن میں آشیاں تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

(سلیم گورمانی)

برادرانِ عزیز! کشتی کا سوراخ صرف ملاحوں کا نقصان نہیں ہوا کرتا بلکہ کشتی کے تمام سواروں کے لئے بھی جان لیوا ہوتا ہے اور جب صورت یہ ہو کہ وہی مسافر اور وہی ملاح ہوں تو پھر ایسے وقت میں خاموشی اور اغماض نادانی ہی نہیں جرم بن جاتی ہے۔ ؎

اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

طلوعِ اسلام

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو، گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے
بیا پیدا خریدارست جانِ ناتوانے را
''پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

غلام احمد پرویزؒ

اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یہ ''کہانی'' سوانح عمری نہیں ہے جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ صرف اقبالؒ کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس ''کہانی'' کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔ (طلوع اسلام)

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام 'ارمغانِ حجاز' میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند باما آشنا بود!
و لیکن کس ندا نست ایں مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

(ترجمہ: جب میں نے اس مٹی (جہان) سے اپنا سامان سفر باندھا یعنی مر گیا، تو سب کہنے لگے کہ مرنے والا ہمارا آشنا تھا (ہم اسے جانتے تھے)۔ (لیکن اس آشنائی کا دعویٰ کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ) ان میں سے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مسافر کہاں سے آیا تھا آ کر اس نے کیا کہا اور اس کی باتوں کے مخاطب کون تھے مراد یہ ہے کہ علامہ کو آخر دم تک اس بات کا شدید احساس تھا کہ انہوں نے جو کچھ کہا ان کی قوم نے اس کو سنا ضرور لیکن عمل نہیں کیا۔ اس نے انہیں ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور ان کے کلام کو ایک شاعر کا کلام سمجھ کر پڑھا لیکن وہ اس شاعر اور اس کی شاعری کی حقیقت کو نہ پا سکے۔)

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؒ کے اپنے اندازے کے مطابق' کوئی شخص اقبالؒ کی حقیقت سے کما حقہٗ واقف نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبالؒ کی جھلک دیکھی کہاں سے جائے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ اس لئے کہ اقبالؒ خود اپنے متعلق اتنا کچھ کہہ گیا ہے کہ اس سے ان کی پوری تصویر نگہِ تجسس کے سامنے آ جاتی ہے۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنت نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے ابھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جا سکیں۔ اس مرقعِ نگہ تاب اور پیکرِ خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تالیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو اقبال اور قرآن' کے عنوان سے

میرے پیشِ نظر ہے اور جسے میں، حضرت علامہ کے ان احساناتِ عظیم کے زیرِ احساس، جن سے میری نگہ تشکر ہمیشہ نگوں سار ہے، اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں۔ خدا مجھے اس قرض حسنہ سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مجھے مجبوراً ان کے اردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

انیسویں صدی کے آخرِ شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلبِ زندہ دلانِ پنجاب، یعنی لاہور کی کیف بار فضائیں، شباب و شعر کی نکہتوں اور رنگ و نظر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درسگاہ اپنے معیارِ تعلیم کی بلندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لاابالیوں کے لئے دور دور تک شہرت حاصل کر چکی ہے، کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب علم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آنکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے، وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ نووارد طالب علم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہوجاتا ہے اسے تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ اس سے پیشتر لاہور محض ایک پیکرِ آب و گل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفل طرب و نشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گلکدۂ حسن و تماشا کے کسی پھول کو اپنا ہمرنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آجاتی ہے لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلش تجسس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پا کر مضطرب و بیقرار واپس آجاتا ہے۔ وہ کبھی اسی تسکین خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جانکلتا ہے لیکن اس جہان رنگ و بو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذب نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر چہچہانے والے ''گل رنگین'' کو نہایت غور سے دیکھتا اور اس سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ ؎

تو شناسائے کُشادِ عقدۂ مشکل نہیں — اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں — یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو — اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے — راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اِک برگِ ریاضِ طور ہے — میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں — زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہوسکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی زندگی کا رُخ بدل لیتا لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے اور وہ خود ہی پکار اٹھتا ہے کہ نہیں! مجھے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو؟ — یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو؟
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو؟ — رشکِ جامِ جم میرا آئینۂ حیرت نہ ہو؟
یہ تلاشِ متصل، شمعِ جہاں افروز ہے — توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یہ تسکین اسے پھر آمادۂ تجسس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے؟ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں، اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔ وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام درنسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے — تپدآں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
نہ شرر ستارہ جوئم، زستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد — بہ نگاہ نا شکیبے، بدلِ امیدوارے

ترجمہ: میری فطرت مجھے کسی ایک مقام پر ٹکنے نہیں دیتی چمن میں صبا کی طرح میں ایک بے چین دل رکھتا ہوں۔ جب میری نظر کسی حسین محبوب پر ٹھہرتی ہے اس گھڑی میرا دل کسی اس سے بڑھ کر حسین کے لیے تڑپنے لگتا ہے۔ شرر سے ستارے کی جستجو کو نکلتا ہوں۔ اور ستارے سے آفتاب کی تلاش میں۔ میں کہیں رکنے کا خیال نہیں رکھتا کیونکہ ایک جگہ ٹھہرنا میرے لئے موت ہے۔ میں اس کی انتہا چاہتا ہوں جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے لئے پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں، کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں، کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفل رنگ و چنگ کی جلوتوں میں اور یہ سب کچھ اس بے باکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

مُدتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با موغولہ مویاں بافتم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغِ عافیت داماں زدم

چنانچہ اسکی یہ ہر رہ نوردی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے **فی کل وادیھیمون** کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت

سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنئے جو اس زمانہ میں اقبالؒ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبالؒ کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟ — گو شعر میں ہے رشکِ حکیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اُڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پُرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کُھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

☆☆☆

اس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں — میں نے بھی سُنی اپنے احبّا کی زبانی
اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرت زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا زرہِ قرب مکانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت — پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؒ کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجۂ شکایت بجا تھی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں رندانِ میکدہ بھی کچھ کم گِلہ طراز نہ تھے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اقبالؒ ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؒ تو — رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
عین شغل مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب — اے تلون کیش! تو مشہور بھی رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو — تیری بے تابی کے صدقے! ہے عجب بیتاب تو

یہ سن کر اقبالؒ مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے — مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبار رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے — مضطرب ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
فیض ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں، آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبالؒ کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینۂ شعلہ ساماں وآذر

فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے! یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں — کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں میرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں — داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرم راز کی جو اس کی سنتا اور اسے سمجھتا۔ لیکن اسے کہیں ایسا ہمنوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل — وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخِ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا۔ اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریبِ شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز — جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے میری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ برسنگ می خورد دِگر است — خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر — کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود، کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی خلش بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہو گئی یا یوں کہئے کہ اس کی دیرینہ کش مکش کی نوعیت متعین ہو گئی۔ اقبالؒ کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک یکسر فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اسے شغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفرز کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا، اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کش مکش تھی جو آگے چل کر مشرق و مغرب کی کش مکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبالؒ کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل اور عشق، دل اور دماغ، خرد و جنوں، علم و حضور، خبر و نظر، ذکر و فکر، رازی و رومی، ابلیس و جبریل، مصطفیٰؐ و بولہب، اہرمن و یزداں یہ سب تقابل درحقیقت ادراک و جذبات کی اس کشمکش کے مظہر تھے۔ مغرب میں میکانکی تصور حیات نے

انسان کو ایک پیکر آب وگل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصور کی رو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزا کے پریشان ہوجانے سے اس کا خاتمہ ہوجاتا تھا۔ اس کے برعکس، ایمانی تصورِ حیات کی رو سے حیاتِ انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس ایمانیات کی رو سے علمِ حقیقی کا سرچشمہ وحی تھا جو سرحدِ ادراک سے ماوراء تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں، تنہا عقل پر استوار تھیں جس کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رو سے معاشرہ کی اساس، ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع ونقصان اور خیر وشر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا لیکن عشق کا تقاضا، دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشوونما ارتقاء کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقل، انسانی زندگی کو سمٹا کر، انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی۔ عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بین تھی، عشق جہاں بیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لب بام رہتی تھی۔ عشق، آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل، بولہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرار بو لہبی

عقل وعشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدۂ مغرب میں، اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دور تھا جس کے متعلق وہ بہت بعد میں کہا کرتے تھے کہ:

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضورؐ کی لذت، کہاں حجابِ دلیل

اقبالؒ کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دوراہہ بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کش مکش میں دماغ، دل پر غالب آجاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہوجاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں، ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقر وقلندری کو خرید لیتیں تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبال، اقبالؒ نہ ہوتا، بلکہ نہ دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق ومحبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے، نہ ملت اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان وقرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے۔ اس نازک وقت میں خود اقبالؒ پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل وحکمت کی فسوں سازیاں، اس کے لئے فریب نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق ومستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں، عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک چلمنی جھلک سے، فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر ودرد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ:

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے — اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

اور کبھی بیتاب ہو کے دعائیں مانگتے کہ:

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبداء فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ ووجدک ضالاً فھدی۔ ''ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات کی طرف راہنمائی کر دی۔'' چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہنمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہنمائی سبل (یعنی پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (29:69) لیکن رسول کی راہنمائی صراط مستقیم، یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رخ اس صراط مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسول گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہ حیات سے مل جاتی ہیں۔ ورنہ ان کا کاروانِ حیات فضائے عقل و خرد کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاش حقیقت میں قلبِ اقبالؒ کی تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبداء فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرایا۔ لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دل پرسوز پکار اٹھا کہ ؎

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم — پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبالؒ کا وہ قلبِ بیتاب جو اس کشمکش خرد و جنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا۔ ایمان و یقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار و سکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں وہ اس کیف و مستی سے پکار اٹھتا تھا کہ:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے — خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں — اہلِ گلشن پر گراں میری غزلخوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی — دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضَو سے اُس خورشید کی اختر میرا تابندہ ہے — چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے
یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی — اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا در سوختی

اس سے اقبالؒ کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہو گئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو ''حسن و عشق'' کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی نُدرت، تشبیہات کی موزونیت، اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتداء ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوب بیان بھی کس قدر حسین و دلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ 1905ء اور 1908ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لے کر چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا ہے میرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینے میں حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار وسکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے۔لیکن اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش وحرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔عشق کی ان بلا انگیز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبالؒ اس حظ وکیف کے لئے قدم قدم پر ھل من مزید کی دعائیں کرتا اور عجیب رقص ومستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

جب اقبالؒ کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل وخرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر، جو اپنے آپ کو وجہِ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا، ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاع حیات، علم و ہنر کا سرور میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سنا تو اقبالؒ سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتایئے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہ کیا ہے؟ اقبالؒ نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

جاتے جاتے طبعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبالؒ نے سنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصدگاہوں سے فضائے آسمانی کی محیر العقول پہنائیوں اور ان میں تیرنے والے تحیر انگیز کروں کا تماشا نظر آئے گا۔اس مردِ دانا نے سنا اور ایک خندۂ زیر لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لا انتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو لامکاں سمجھا تھا میں

اقبالؒ کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہو گیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعین کر لیا۔اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

عشق سے اقبالؒ کی مراد وہ نظام ربوبیت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشوو ارتقا تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا لیکن اس کی ابتداء کسی ایسے خطۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جا سکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اولین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلۂ جوالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا چنانچہ اس نے یورپ ہی سے اپنے رفقاء کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبدالقادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط — اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں — خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعین انداز سے کہ

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا — جہاں میں مانندِ شمع سوزاں، میانِ محفل گداز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی — فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا — بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں، ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لے کر اقبالؒ ہندوستان واپس آیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک و شبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون و طمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کے لئے۔ آیا نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ عقل لے کر، آیا سوزِ عشق خرید کر اور اس متاع سوز و ساز اور سرمایۂ تپش و گداز کو لے کر آیا۔ اس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق و ایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں۔ گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف و مستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد و رقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ میرا ذوق و شوق — دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے — نغمہ اللہ ہو، میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق و جنون کی ان وادیوں میں پہنچ کر اقبالؒ نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل و خرد کو تیاگ دینا، قرآن کا پیغام نہیں رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے جو اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کے لئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں، ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا۔ اقبالؒ جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق و مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیر کی ساز حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیر کی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیر کی محکم اساس
عشق چو با زیرکی ہمبر شود
نقشبدِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را بازیرکی آمیز دہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ مشرق میں ملاّ اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و ناامیدی کے مسلک گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر مغرب اور مشرق کے ان دونوں تصوراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبالؒ سے یہ بہت بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ ''فرشتوں کے نام خدا کے پیغام'' میں ہے کہ

تہذیب نوی کارگہِ فتنہ گری ہے آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اور انہی آدابِ جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبالؒ کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیان حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے ملاّ سے برملا کہا کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

جب اربابِ شریعت و طریقت کی سطح بیں نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں۔

کیا صوفی و ملاّ کو خبر میرے جنوں کی ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرار حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (Dust-Cover) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکر اسلامی کے شجر طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا۔ شجرِ ملت کبھی شگفتہ و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی دیا ہے میں نے انہیں ذوق آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خواب گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا' آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا رکھتا ہوں نہانخانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تاخاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

واضح رہے کہ اقبالؒ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں آجائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان' انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے' ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں' اسی مقصد کے لئے اس نے ملت اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کر کے امنڈے چلی آ رہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے لیکن بایں ہمہ' وہ اس سیلاب بلا انگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمرہانِ سست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ ؎

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے

قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں — اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں — شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا' پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اٹھتا اور حزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہم نشیں! مسلم ہوں میں' توحید کا حامل ہوں میں — اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے — اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا — اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
میری ہستی' پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے — میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے' چشم برعہد کہن رہتا ہوں میں — اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے — میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں — دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ ناامیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ ان پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا' اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی' قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاع سوز و گداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگا کرتا تھا کہ:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ' سوزِ صدیقؓ دے
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری' آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ملت کے مستقبل کا یہی غمِ پنہاں تھا جس نے اقبالؒ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی' ایک رات' پچھلے پہر' میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آ رہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا تھم اے رہرو! کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا

اس غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے وہ محفل اُٹھ گئی جسدم کہ مجھ تک دور جام آیا

علی الصباح حسب معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیت مزاج کا پوچھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے! انہوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیر لبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقام ہوش سے آساں گذر گیا اقبال مقام شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب! آپ دیکھتے نہیں کہ

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق خلوتیانِ میکدہ' کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ میری تمام سرگذشت' کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویش انگیز ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو' کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہو گا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آ گئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایک ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اسنے جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں اکثر ہوتا ہے جب کہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی' نفسِ انسانی' وحی' حیات بعد الممات' مستقل اقدار وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اسی کی پشت پر لکھ دیا کہ

میں اصل کا خاص سومناتی آباء مرے لاتی و مناتی

تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت
دِیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دِیں سِر محمدؐ و براہیم
دل در سخنِ محمدیؐ بند — اے پُورِ علیؓ، زبو علی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادتمندان میں ہوتا تھا، اندر آ گئے۔ خیریت مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے دیکھا تو نہیں۔ کل شام فلاں صاحب سے سنا ضرور تھا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے۔ آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا، کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا؟ آپ مجھے جانتے ہیں کہ

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظر باز ونکوبین و کم آزار! — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال — کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مدیر صاحب نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشاں نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے مجھے اس کی کیا پرواہ ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں ابتک — مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر، حسب معمول، پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گذرا! فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اسنے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقہ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے' فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے کہ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبداءِ فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو کرتی ہے چمک جس کی ستاروں کو عرق ناک

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں' نہ قیمتی صوفے اور قالین ہیں۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں' نہ موٹر ہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

☆☆☆

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہ

بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے' یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے — گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا
دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ — کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی — خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی — سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے' آدابِ خداوندی

اُدھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پائے تھے کہ اقبالؒ جو کچھ کہتا ہے اسکا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ اسکی فکر 'نیٹشے' 'برگسان' 'الیگزینڈر' وارڈ' 'چیمز' جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہین منت ہے۔ اقبالؒ یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبع علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟ میری فکر نہ مشرقی مکتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری — یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا کہیں سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے — یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہی صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزینیم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نگردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بہ چشمِ خود نہ دیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت' میری نگہ تجسس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ ؎

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا — یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طربناک
میں صورتِ گُل دست صبا کا نہیں محتاج — کرتا ہے میرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محرومِ خواب ہیں' میرا پیام اس کے لئے طائر پیش رس ہے'

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نواؤں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

لہٰذا اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آ جائے۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا جسے آ گئی میسر مری شوخئ نظارا

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبال' جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

یہ شاعری نہیں ہے۔ نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو' اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو' اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف لے جا رہا ہو' اسے شاعری سے کیا واسطہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

یہ وہی ''رازِ درونِ میخانہ'' تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زِبرونِ در گذشتم' ز درونِ خانہ گویم سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست کہ برما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اسے حسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو؟ تم اسے عہد کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو؟ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گُل و مُل کی فرضی کہانیاں ہیں؟ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشاں خیالیاں ہیں؟ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے' تمہارا یہ اندازہ؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال! اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا' تم آؤ! میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

اگر دیوانۂ آید کہ در شہر افگند ہُوئے دو صد ہنگامہ بر خیزد ز سودائے کہ من دارم

مخور ناداں غم از تاریکئ شبہا کہ می آید کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم

ندیمِ خویش می سازی مرا' لیکن ازاں ترسم ندارد تابِ آں آشوبِ غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوراتِ مشرق سے' نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہ مردِ خود آگاہ و خدا مست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔ ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمع عالم تاب سے اکتسابِ ضیاء کیا ہے۔ اسی یمِ ناپیدا کنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام شرح رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر بعد ازیں ناید چومن مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے راز' ان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے ؎

چو مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

برادران! یہ ہے وہ اقبالؒ جس نے کہا تھا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند باما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

ترجمہ: جب میں نے اس مٹی (جہان) سے اپنا سامان سفر باندھا یعنی مر گیا، تو سب کہنے لگے کہ مرنے والا ہمارا آشنا تھا (ہم اسے جانتے تھے)۔ (لیکن اس آشنائی کا دعویٰ کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ) ان میں سے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مسافر کہاں سے آیا تھا آ کر اس نے کیا کہا اور اس کی باتوں کے مخاطب کون تھے مراد یہ ہے کہ علامہ کو آخر دم اس بات کا شدید احساس تھا کہ انہوں نے جو کچھ کہا ان کی قوم نے اس کو سنا ضرور لیکن عمل نہیں کیا۔ اس نے انہیں ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور ان کے کلام کو ایک شاعر کا کلام سمجھ کر پڑھا لیکن وہ اس شاعر اور اس کی شاعری کی حقیقت کو نہ پا سکے۔

(مطبوعہ طلوعِ اسلام، اپریل 1953ء)

مولانا حافظ غلام مرشد مرحوم
سابق خطیب شاہی مسجد، لاہور

علامہ اقبالؒ سے سعادت مندانہ ملاقاتیں

(مولانا) حافظ غلام مرشد تحریکِ پاکستان کے ان بلند مرتبت کارکنوں میں سے تھے جنہیں علامہ اقبال اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہم کا اعتماد اور تقرب حاصل تھا۔ تحریکِ پاکستان کی حمایت میں جب جمعیت علماء اسلام کا قیام عمل میں آیا تو مولانا شبیر عثمانی کی علالت کے باعث قائداعظمؒ نے غلام مرشدؒ کو اس علماء اسلام کانفرنس کے افتتاحیہ خطبہ دینے کے لئے منتخب کیا۔ (مولانا) غلام مرشد نے پچاس سال تک لاہور میں درسِ قرآنِ کریم دیا۔ ذیل میں علامہ اقبالؒ سے ان کی چند ملاقاتوں کا احوال درج کیا جا رہا ہے جو انہوں نے قلم بند کرائی تھیں اور کئی عشرے پہلے فنون اور نقوش میں شائع ہوتی رہیں۔ (مدیر)

خاکسار کو علامہ اقبالؒ کی زیارت کا شرف اس تعلیمی زندگی میں حاصل ہو چکا تھا۔ جو اکتوبر 1914ء تک درس نظامی اور مولوی فاضل کے نصاب میں مہارت پیدا کرنے کے لئے گزرا جو پنجاب یونیورسٹی کا اس وقت مروجہ سلیبس تھا۔ اس کی تکمیل کے لئے میں نے کام کیا جس کی تدریس کا فرض یونیورسٹی نے اورینٹل کالج کے سپرد کیا ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور دارالعلوم نعمانیہ ہند کے صدر مدرس (پرنسپل) مولانا غلام رسول صاحب گجراتی اور مدرسہ حمیدیہ کے پرنسپل مولانا محمد ذاکر صاحب بگوی اور مفتی عبداللہ ٹونکی کی خاص توجہ اور التفات سے دونوں کام پایہ تکمیل کو متوقع عزت کے ساتھ پورے ہوئے اور فاضلیت کی سندیں حاصل کیں اور 1915-1914ء کو دورہ حدیث کی سند حاصل کرنے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی حریت پسندی کی وجہ سے اسیر مالٹا ہو گئے۔ وہ دورہ حدیث کے قابل اعتماد تلامذہ سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی بیعت لیتے تھے۔ سالانہ امتحان میں اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف فرسٹ رہا۔ بلکہ ایک ریکارڈ قائم کر دیا یہ مستند ترین سندیں حاصل کرنے کے بعد اجمیر شریف میں جو نظام حیدرآباد (دکن) نے دارالعلوم قائم کیا اور جس کے وائس چانسلر نظام دکن کی طرف سے مولانا انوار اللہ مدار المہام امور مذہبیہ تھے اور پرنسپل مولانا معین الدین تھے۔ علمائے خیرآباد میں مولانا عبدالحق خیرآبادی جو مولانا فضل الحق خیرآبادی جو جنگ آزادی میں گرفتار ہوئے اور جن کو دریائے شور کی سزا ملی اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی ساری علمی وراثت اور ہزاروں احترام کے قابل حضرت مولانا ابوالبرکات ٹونکی، انہوں نے فلسفہ قدیم، ہیئت، اقلیدس اور منطق کی تمام قلمی اور غیر قلمی کتابیں یونیورسٹی کے سپرد کر دیں۔ جو حیدرآباد (دکن) کے کتب خانے میں تھیں میں نے دو سال وہاں رہ کر عقلیات کے اس

نصاب کو مکمل کیا اور سالانہ امتحان میں فرسٹ آیا۔ اور ممتحن اعلیٰ ابوالبرکات ٹونکی صاحب نے میرے پرچے پر یہ سنہری حروف رقم فرمائے کہ اگر امتحان کا قانون مقرر کئے ہوئے نمبروں سے زیادہ نمبروں کی اجازت دیتا تو میں اس طالب علم کو بجائے سو نمبروں کے 110 (ایک سو دس) نمبر دیتا۔ وہاں سے فراغت کے بعد اپنے مرحوم والد کی اس وصیت پر عمل کیا' جو میری ایک سال کی عمر میں انہوں نے اپنے مرشد کامل خواجہ اللہ بخش صاحب تونسویؒ سے یہ کہا تھا کہ میں اپنے لڑکے کو انگریزی حکومت کے کسی محکمے میں خصوصاً فوج میں بھرتی نہیں کراؤں گا۔

اور آپ کے اس ارشاد کے مطابق کہ خواستہ حرام ناخواستہ حلال کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی حاصل کردہ تعلیم کا کسی پرائیویٹ درس گاہ میں درس دوں گا۔ چنانچہ پہلے سیال شریف ضلع سرگودھا میں جو ضیاء العلوم کے نام سے درس گاہ قائم تھی۔ حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کے جانشین حضرت حامد میاں کے حکم کے مطابق درس دیا۔ پھر انہیں کے حکم سے سور کی' تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں اپنے مرحوم و مغفور کے وفات پا جانے کی وجہ سے ان کے عزیزان کی تعلیم کی تکمیل کے لئے وہاں درس دیتا رہا۔ اس درس گاہ کو اس وقت خدا نے بہت عزت بخشی کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے طالب علم داخل ہوئے اور دورہ حدیث کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ یہاں رہ کر خلیفہ شجاع الدین مرحوم و مغفور کی ترغیب پر آل انڈیا مسلم لیگ کا ممبر ہوا اور جمعیت العلمائے ہند دہلی کی طرف سے صوبائی جمعیت کا صدر مقرر ہوا اور پنجاب خلافت کمیٹی کا وائس پریذیڈنٹ ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے بعد منتخب کیا گیا۔ جس کے پریذیڈنٹ مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ جو مسٹر محمود علی قصوری بیرسٹر کے والد ماجد تھے اور ملک لال خان مرحوم جس کے سکریٹری تھے۔ یہ کمیٹی ستم رسیدہ ترکوں کی حمیت و امداد کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اور جس گہری اور بدتر چال سے ٹرکی کا عروج ختم ہوا وہ ظاہر تھی۔ اسی انگریز نے خلافت کمیٹی کو ناکام بنانے کے لئے یہاں معززین کو انعامات اور خطابات کے لالچ دے کر خرید لیا۔

اور ان خرید شدہ بزرگوں نے سول اور ملٹری گزٹ میں ان کی طرف سے اس قسم کے مضامین شائع کرنے شروع کر دیئے کہ قریشیوں کے سوا اسلامی خلافت کا کوئی حقدار نہیں۔ یہاں تک کہ اس اخبار نے خود بھی ایسے افتتاحیئے اور شذرات لکھنے شروع کر دیئے جن کا عنوان ''الائمۃ من القریش'' ہوتا کہ پیغمبرؐ کا اعلان موجود ہے کہ میرے بعد خلیفہ اور امام قریشی ہوں گے۔ پنجاب کمیٹی کے موجودہ صدر نے مجھے یاد فرمایا کہ ہماری تحریک کو ناکام بنانے کی جو انگریز نے سازش شروع کی ہے کیا آپ اس روایت کا تجزیہ کریں گے۔ میری اطلاع دینے پر کمیٹی نے بھاٹی دروازہ کے باہر ایک پبلک جلسے کا اعلان کر دیا اور میں نے اللہ کی توفیق سے اس پبلک جلسے میں تقریر کی۔ یہ میری پہلی سیاسی تقریر تھی۔ اور اخبار زمیندار کے نمائندوں کے سوا دوسرے اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کا نمائندہ بھی شامل تھا اور مسلمانوں کا انگریزی اخبار مسلم آؤٹ لک' جو مولانا عبدالحق کی زیر قیادت نکل رہا تھا۔ اس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ اسے تاریخی اجلاس کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ خاکسار نے اس پرامن جلسے میں اس حدیث کا پورا تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ یہ حدیث نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایتاً صحیح۔

1۔ یہ الفاظ صحیح بخاری اور مسلم میں موجود نہیں اور جن صحیحین کے سوا جن بزرگ محدثین نے اس روایت کو اپنی کتابوں

میں درج کیا ہے۔ ان کی سندوں کے جو سلسلے بھی بیان کئے ہیں۔ ہر سلسلے میں کوئی نہ کوئی بدترین کذب (جھوٹ) کا مرتکب ہے' روایت کا تو یہ حال ہے۔

2۔ درایتاً کہ قرآن نے مسلمانوں کو اعلیٰ اقتدار امامت' امارت اور خلافت کی بشارت دی ہے۔ اس میں ہاشمیت اور قریشیت کی کوئی تمیز نہیں (سورہ چوبیس' آیت پچپن' پارہ اٹھارہ رکوع تیرہ) اور جن بزرگ مسلمانوں نے قریشیت کو خلافت کی شرط قرار دیا ہے۔ جو اپنے دور میں بہت معزز و محترم محقق سمجھے جاتے تھے۔ اور بڑی بڑی عقائد کی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ حضرت علامہ تفتازانی کی شرح مقاصد سے کون بے خبر ہے اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف سے اور حضرت شاہ ولی اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ سے کون ناواقف ہے بلاشبہ انہوں نے اپنی کتابوں میں شرائط خلافت کے متعلق جو لکھا ہے۔ ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ قریشی ہو مگر یہ حضرات خود یہ نظریہ اپنے دور کی غیر قریشی حکومتوں کے دوران میں کیوں نہ پیش کر سکے۔ (حجتہ اللہ البالغہ، مطبوعہ مصر، ص: 111، جلد دوم)۔

3۔ ان ترکوں کی شرافت اور دیانت کا وہ حال ہے کہ انہوں نے ترکی میں اپنے دور کے بہت بڑے مجاہد عثمان کے عہد میں حکومت عثمانیہ کی بنیاد رکھی اور اقتدار اعلیٰ کے مالک ہو گئے۔ مگر جب تک کہ حکومت عباسی کا دور قائم رہا۔ وہ انہیں خلیفہ تسلیم کرتے رہے اور سلیم الاول کے دور میں تمام اسلامی سلطنتوں نے ان کو خلافت کا اعزاز بخشا۔ یہ واقعہ مئی 1512ء کو پیش آیا۔ عثمان کے اقتدار کی بنیاد 27 ستمبر 1999ء کو پڑی۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر ان کے اسی اعزاز کی خاطر مسلمان اپنے جمعوں اور عیدین کے خطبوں میں انہیں کا نام لے کر ان کی فتح و کامرانی کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

اس پہلی سیاسی تقریر کے بعد علامہ اقبال نے اس خاکسار کو یاد فرما کر شاباش دی اور میری پورے مجمع کے سامنے یہ پہلی ملاقات تھی۔

(2) دوسری اہم ملاقات کا شرف تقریباً سال بھر کے بعد ہوا۔ علامہ اقبال نے اس خاکسار کو علامہ سے والہانہ عقیدت مندی رکھنے والے مسٹر محمد دین تاثیر (جو بعد میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے) کے ذریعہ بلوا بھیجا' علامہ اقبال کو ڈاکٹر تاثیر سے پرخلوص محبت تھی اور اگر یہ کسی وجہ سے ان کے پاس نہ جاتے تو ان کو بہت بے چینی ہوتی تھی۔ خاکسار نے کناری بازار کی اونچی مسجد میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو قرآنی ہدایات کا درس دینا شروع کیا ہوا تھا۔ اور انہیں اجازت دے رکھی تھی کہ انہیں جو شبہات قرآنی تعلیم کے متعلق پیش آئیں۔ انہیں درس کے اختتام کے بعد پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے ماسٹر عبداللہ چغتائی اور ڈاکٹر نذیر احمد پنشنر گورنمنٹ کالج کے ساتھ مل کر قرآن کریم کی کتابت کے متعلق سوال پیش کیا۔ خاکسار تقریباً ایک ہفتے تک اس سوال کا جواب دیتا رہا اس علمی گفتگو کا علم علامہ اقبالؒ کو ڈاکٹر تاثیر کے ذریعے ہو گیا اور اپنے حاضرین مجلس کے سامنے اپنے مخلص احباب کی موجودگی میں یہ بحث شروع ہو گئی۔ خاکسار نے پوری تفصیل کے ساتھ اس کا جواب عرض کیا۔

1۔ قرآن کریم نے کتابت کے جتنے لوازم ہیں۔ انہیں ذکر کر دیا ہے۔ جو آج تک تسلیم کئے جاتے ہیں۔ قلبی خیالات و

معلومات کو قلم کے ذریعے قلم بند کرنا (سورہ نمبر:94 آیت نمبر:5-4) یعنی جس خدا نے تم پر قرآن کریم ایسی انمٹ کتاب بھیجی ہے۔ اسے قلم بند کرنے کے لئے قلم بھی عطا فرمایا۔ اور ان آخری مکمل اور واضح ہدائتوں کو قلم بند کرنے کے لئے کاغذ سے بھی نوازا اور ان کے قلم بند کرنے کے لئے خوبصورتی کے لئے سیدھی لائنوں میں لکھنے کے اسباب بھی فراہم کر دیئے (سورہ نمبر:52 آیت نمبر:2-3 کتاب مستور فی رق منشور) اور ان انمٹ ہدایات خداوندی کہ تمہیں پوری طرح پڑھانا اور یاد کرانا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کو ترتیب وار لکھوانا اور تفصیلات بیان کرنا بھی ہے (سورہ نمبر:75، آیت نمبر:17-18-19) اسی ''رق منشور'' کی تفسیر ایک ایسے لفظ سے کی جو آج تک مروج ہے قرطاس ابجد (سورہ نمبر:6، آیت نمبر:7)۔

2۔ قیصر و کسریٰ وغیرہ کی حکومتوں نے جو کھلی تجارت کی تحریری اجازت جو حضرت ہاشم کے چاروں بیٹوں کو دے رکھی تھی وہ بھی قلموں سے لکھی ہوئی تھی اور اس دور کے مروجہ کاغذوں پر لکھی ہوئی تھی اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو نبوت و رسالت سے نوازا جانے سے پہلے بیس برس کی عمر میں بنی قیس اور بنی کنانہ میں جو جنگ ہوئی جسے حرب فجار کہتے ہیں۔ اس کے بعد جو معاہدہ طے پایا تھا۔ جو تاریخ میں حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ بھی قلم سے لکھا گیا تھا۔ اس معاہدے میں آپ ﷺ نے نہ صرف شرکت فرمائی۔ بلکہ اس معاہدے کا مضمون بھی تیار فرمایا۔ جس کی دو شقیں بہت مشہور ہیں۔ فریقین میں ہر ایک فریق جو حرب فجار میں شامل ہوئے تھے وہ مظلوم کی حمایت کرے اور دوسری شق اس معاہدے کو توڑنے والے اور ظلم و ستم کرنے والے کو مکے میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ آپ ﷺ نے رسالت اور ختم نبوت سے نوازے جانے کے بعد کئی بار اس معاہدے کا تذکرہ فرمایا۔ نہ صرف تذکرہ فرمایا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ان شرائط پر آج بھی اگر کوئی مجھ سے معاہدہ کرنا چاہے تو میں تیار ہوں (طبقات ابن سعد) پھر جب مکہ معظّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ تو وہاں کے امن پسند قبائل سے تحریری معاہدے کئے اور صلح حدیبیہ کے معاہدے کو کون نہیں جانتا جو 6ھ میں ہوا۔ یہ بھی کاغذ پر تحریر تھا۔ پھر صلح حدیبیہ دو درجن کے قریب کسریٰ و قیصر اور دوسرے سلاطین کو گرامی نامے لکھے جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی ان کے لئے تو کاغذ مل گیا۔ نہیں ملا تو قرآن کے لکھنے کے لئے۔ نیز حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل جب تمام عرب کا ایک بڑا اجتماع حج کے موقع پر ہوا۔ جس میں زمانہ جاہلیت کے قصیدوں کا انتخاب کیا گیا۔ سات قصیدوں کا انتخاب کیا گیا جن میں پہلا قصیدہ امراؤالقیس کا ہے۔

3۔ علامہ ابن ندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں اپنے پہلے مقالے کے پہلے فن میں ایک عنوان لغات الامم میں العرب والعجم واکلامہا وانواع خطوطہا واشکال کتابات ہا قائم کیا۔ جس میں اس نے ثابت کیا ہے مختلف حالتوں میں اور سائزوں میں ہزاروں سال سے قسم قسم کے کاغذات موجود تھے۔ ان میں مصر کے ترقی یافتہ کاغذ کی نوعیت پر اچھی بحث کی ہے۔ ایرانیوں اور رومیوں نے اپنی ذلیل ترین شکستوں کا انتقام لینے کے لئے اسلام کا لباس اوڑھ کر اس قسم کی حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں کہ عام لوگ ان متضاد روائتوں سے متاثر ہو کر حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ اور خاتم الکتب قرآن مجید کی عظمت ان کے دلوں سے اٹھ جائے۔ کیونکہ ان کو جو شکست ہوئی قرآن کی بدولت ہوئی۔ چنانچہ سب سے زیادہ جو حدیث مستند ترین کتابوں میں آئی وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے وصال تک کوئی بھی حصہ قرآن کا جمع نہیں ہوا۔ اور انہیں زیدؓ ابن ثابت

کے ذریعے مشہور ہوا کہ آپ کے دور میں قرآن پاک اپنے طور پر بعض صحابہ کرام نے ہڈیوں پر، چیتھڑوں پر، پتوں پر اس کے کچھ حصے لکھوا رکھے تھے، جو سب سے پہلے جنگ یمامہ میں حفظ قرآن کی نعمت سے مالا مال ہوئے تھے۔ حفاظ وسیع پیمانے پر اس جنگ میں قتل ہوئے اور ان محدثین کے قول کے مطابق انہیں قرآن کریم کے مٹ جانے کا خطرہ لاحق ہوا؛ حضرتؓ نے جمع قرآن کی تجویز حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کی جو ردوقدح کے بعد منظور ہوئی۔ اور حضرت زید ابن ثابت انصاری کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی، جو اپنے طور پر قسم قسم کی لکھی ہوئی تحریریں پیش کریں اور ان کی نگرانی میں قراطیس بھی مل گئے یہی نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے اور حضرت عمرؓ کی نگرانی میں رہا۔ انہوں نے وفات کے وقت اپنی صاحبزادی ام المومنینؓ حفصہ کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب عثمانؓ کو علم ہوا۔ کہ لوگوں نے اپنے طور پر بھی قرآن کے بعض حصے اپنی خود ساختہ تفسیروں کے ساتھ بنا کر لکھ رکھے ہیں۔ لہٰذا حضرت ام المومنین حفصہؓ سے قرآن کا مستند نسخہ منگوا کر ایک بارہ آدمیوں کی کمیٹی میں پیش کر دیا اور حکم جاری کیا کہ جس جس کے پاس جو بھی قرآن کا حصہ لکھا ہوا ہے۔ وہ اس کمیٹی کے سامنے پیش کرے۔ پھر اس معیار پر جن کی اپنے طور پر تحریر کی ہوئی آیتیں اور تفسیریں منطبق نہ ہوئیں تو انہیں جلا کر راکھ کو دفن کر دیا اور اس مستند نسخے کی متعدد مستند نقلیں کروا کر اپنی سلطنت کے اسلامی ممالک کے ہر صوبے میں بھیج دیں اور گورنروں کو ہدایت کی کہ جو بھی عالم قرآن کے درس دینے پر متعین ہو۔ وہ اس نسخے کو پیش نظر رکھے اور اپنی وفات تک قرآن حکیم کے ان مستند نسخوں کو مدرسین کی تشریحات سے پاک رکھو اور اگر تم بضرورت تشریح کرو تو ان تشریحات کو قرآن حکیم کا جزو نہ بننے دو۔

ڈاکٹر اقبالؒ نے اس خاکسار کا امتحان لینے کی غرض سے تاریخی شہادت طلب فرمائی جس کے جواب میں خاکسار نے یہ عرض کیا کہ قرآن کریم کی جمع اور ترتیب کو قرآن کے بدترین مخالف بھی تسلیم کرتے تھے: جن ہدایات کو یہ شخص یعنی سرکار دو عالم ﷺ ہدایات خداوندی کے نام سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ درحقیقت ہماری نظروں میں پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں اس نے لکھوا لیا ہے اور جو صبح و شام اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں۔ (سورہ نمبر: 25، آیت نمبر: 5، پارہ: 19، رکوع: 14) اور اس تاریخی واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب مختلف ممالک کی طرف سے حضور ﷺ کی خدمت میں وفدوں کی شکل میں وفد آئے اور ان میں سے ایک ثقیف کا وفد تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ اس وقت قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ ﷺ نے اپنا فرض تلاوت ختم فرمایا۔ تو ان سے معذرت کی کہ تمہیں میرے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑا جب میں اس قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتا ہوں اور جب تک اس حصے کو ختم نہ کر لوں میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ چنانچہ تم سے زیادہ تعداد میں لوگ مسجد میں قدیم ترین اور مخلص ترین مسلمان بھی انتظار میں تھے۔ وفد ثقیف نے گرویدگی اور محبت سے قرآن پاک کی روزانہ تلاوت کے متعلق پوچھا۔ آپ ﷺ کی عادت پوچھی، تو فرمایا، ایک دن سورۃ فاتحہ سے شروع کر کے سورۃ توبہ کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چوتھے دن سورۃ بنی اسرائیل سے شروع کر کے سورۃ الفرقان کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں، اور پانچویں روز سورۃ شعرا سے شروع کر کے سورۃ یٰسین کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور چھٹے دن سورۃ والصافات سے شروع کر کے سورۃ الحجرات کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں اور ساتویں

دن سورۃ ق سے لے کر سورۃ والناس کی آخری آیت پر ختم کرتا ہوں۔ یہ بے مثل قرآت صدیوں تک علماء کی نظر میں فہمی بشوق کے نام سے مشہور تھی۔ آپ (اقبال) کے دریافت فرمانے پر خاکسار نے عرض کیا کہ اس بے مثل قرآت کا تذکرہ صحاح ستہ میں سنن ابوداؤد میں موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ ان روایات کا کیا بنے گا۔ جن میں بڑے زور شور سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی جمع وترتیب کا ولولہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں جنگ یمامہ میں بہت سے قاریوں کے شہید ہونے سے پیدا ہوا۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں عرض کروں گا کہ یہ روایات بھی مسلمانوں کو قرآن کریم سے منحرف کرنے کے لئے گھڑی گئی تھیں۔ بڑے زوردار الفاظ میں یہ اعلان موجود ہے کہ یہ انمٹ حقیقت اور ناقابل تردید صداقت ہے کہ صرف ہمیں نے اس قرآن کو اتارا ہے جو قیامت تک انسانوں کو ان کے فرائض کی یاددہانی کراتا رہے گا۔ اور یقیناً ہم ہی اس کی قیامت تک حفاظت کرتے رہیں گے اور عرض کیا کہ اس قسم کی احادیث قرآن کے مقابلے میں کون پیش کرسکتا ہے سوائے اس کے کہ فریب کار اپنی فریب کارانہ اور ابلیسیانہ شکل میں ایسی حدیثیں وضع کریں اور ہمارے سادہ لوح انسان ان پر بحثیں کریں۔ کسی میں حضرت ابوبکرؓ کی منقبت ہو۔ کسی میں حضرت علیؓ کی اور حدیثیں گھڑنے والے ان دونوں کے لئے متضاد حدیثیں وضع کرتے تھے' مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو حیرانگی میں ڈالتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے چھ برس تک اس قسم کی احادیث کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس لئے ان کے دور میں قرآن حکیم تھا اور جگہ جگہ اس کی ہر قسم کی تعلیم کا انتظام تھا۔ وہاں قرآن حکیم نے جن اوامر اور نواہی کی کوئی خاص کیفیت' کمیت' ہیئت' اور وضع اور شکل متعین نہیں فرمائی اور حضور ﷺ کو حکم دے دیا کہ جو ان اوامر اور نواہی کی تفصیلات حالات کے مطابق آپ چاہیں متعین فرمادیں اور آپ کے متبعین کا فرض ہے کہ اس اسوہ حسنہ کی تعمیل کریں۔ ہاں اگر آپ کے جانشین اپنی مجلس شوریٰ کے ساتھ مل کر کچھ تبدیلی کرنا چاہیں' تو تبدیلی کرسکتے ہیں جیسے خود حضور ﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم میں بدر سے لے کر حنین تک متبادل صورتوں میں تقسیم کیا۔ محدثین کے اسی جمع وتدوین کے کارنامے جو مسلمانوں کی محض سلف صالحین کی محبت کی وجہ سے سرانجام پائے وہ آخر پہلی دفعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ پھر اس جمع وتدوین کے سلسلے میں جب خارجی اور رافضی کے دو متضاد فرقے پیدا ہو گئے' جو افتراق سے قبل ان مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنے جو صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان میں سے دو جنگیں جنگ جمل اور جنگ صفین کے نام سے مشہور ہیں' ان دونوں جنگوں میں تقریباً نوے ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ اور جب ان کی منشا کے خلاف صلح ہوگئی۔ جو ان کے مشن کے خلاف تھی وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ حمایت کرنے والے شیعہ کہلائے اور شدید ترین مخالفت کرنے والے خارجی پھر ان کی آپس میں جنگ ہوئی' جسے جنگ نہروان کہتے ہیں۔ اور تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان' مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور وہ اپنے تفرقے میں کامیاب ہو گئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں جو احادیث کی صحت وعدم صحت کی منظم کوشش شروع ہوئی وہ بھی بے وقت ہونے کی وجہ سے ناکام رہی۔

(3) علامہ اقبال مغفور نے اپنا خاص قاصد بھیج کر فوری طور پر پہنچنے کا حکم دیا۔ جب یہ خاکسار اس حکم کی تعمیل میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچا۔ دیندار علماء' وکلا' مخلص احباب' جن میں جج صاحبان بھی موجود تھے۔ خاص طور سے جسٹس دین محمد

صاحب موجود تھے ان دنوں ان کے عقیدت مند دوست اور خدام 1926ء کے الیکشن کے لئے آپؒ کو پنجاب کونسل کی لاہور سیٹ سے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اتنے بڑے بزرگوں کے اجتماع کو دیکھ کر ایک گونہ حیرت بھی ہوئی۔ اور ایسے وقت میں یاد فرمائی پر تعجب بھی ہوا میرے جانے پر ان بزرگوں کے مجمع کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھا۔ جو قرآن کریم کی بعض آیات کے منسوخ ہونے پر بحث فرما رہے تھے۔ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ علامہ نے پیار سے فرمایا ''بدو مولوی میرے پاس آجاؤ اور تم بھی حصہ لو'' میں نے دونوں طرف کے اکابر کی طرف اشارہ کرتے عرض کیا کہ آپ اور ان بزرگوں کی موجودگی میں اس نوعمر خاکسار کو جس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہے۔ اتنے اہم مسئلے میں کیسے حصہ لے سکتا ہے لیکن آپؒ نے فرمایا کہ ''میں حکم دیتا ہوں کہ آپ بھی اس سلسلے میں اظہار خیال کریں۔ خاکسار نے گزارش کی کہ آپؒ کو اور ان بزرگوں کو معلوم ہے کہ قرآن کریم میں نسخ آیات کا ذکر ضرور موجود ہے بلکہ تبدیلی آیات کا بھی (سورۃ نمبر:45، آیت نمبر:29، پارہ: 25، رکوع:20) تحویل و انتقال' ان معنوں میں بھی ان دونوں بزرگ جماعتوں کو معلوم ہے وراثت کی کتابوں میں تناسخ المیراث کا ایک مستقل باب ہے۔ یعنی ترکے کا انتقال غالباً اسی معنی کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک عقیدہ آواگون کا سلسلہ جاری ہے۔ تیسرا معنی ازالہ ومحو' مٹا دینا (سورۃ نمبر:22، آیت نمبر:52، پارہ:7، رکوع:14) آیات خداوندی کا لفظ بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مناظر قدرت اور تاریخی قوموں کے آثار قدیمہ (سورۃ نمبر:17، آیت نمبر:22، پارہ:15، رکوع:2)؛ (سورۃ نمبر:16، آیت نمبر:11ا-12-13 وغیرہ)؛ (سورۃ نمبر:26، آیت نمبر:8، پارہ:19، رکوع:1)؛ آیت نمبر:27، رکوع 4'؛ آیت نمبر:103، رکوع:5'؛ آیت نمبر:121، رکوع:6؛ آیت نمبر:139، رکوع:7؛ آیت نمبر:158، رکوع:8؛ آیت نمبر:174، رکوع:9؛ آیت نمبر:190، رکوع:10) سوۃ شعرا، آیت نمبر:129، سورۃ نمبر:26) یہ آیت مثالیں ہیں۔

سلسلہ رسالت کے شروع ہونے سے لیکر آخر تک جو خدا کی طرف سے نبیوں کی وساطت سے قوموں کو ہدایات دی گئیں' چنانچہ حضرت آدمؑ کو جب وحی نبوت کے ذریعے چند انمٹ ہدائتیں دیں۔ تو ان کی تعبیر آیات اللہ سے کی (سورۃ نمبر:2، آیت نمبر:39، پارہ پہلا، رکوع:4؛ سورۃ نمبر:7، آیت نمبر:35، پارہ:8، رکوع:11؛ سورۃ نمبر:9، آیت نمبر:103، پارہ:9، رکوع:3) اور حضرت نوحؑ کے تذکرے میں (سورۃ نمبر:91، پارہ:11، رکوع:12)۔

آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل انمٹ ہدائتیں اللہ پاک کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ سے دی گئیں۔ وہ تو ان کی وفات کے بعد ان کے خودغرض' دین فروش مذہبی پیشواؤں نے دولت مندوں اور حکومتوں سے پیسے بٹورنے کے لئے فراموش کر دیں اور عوام کے دلوں سے ان کے نقش ونگار مٹا دیئے۔ ان احکام خداوندی کی جگہ اپنی پیشوائیت کو قائم رکھنے کی غرض سے کچھ احکام خود گھڑ لئے۔ ان مذہبی پیشواؤں کے کے مخترع احکام کی تعبیر بھی آیات ربانی سے کی اور انہیں آیات اللہ کہنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر خدا کے پیدا کئے ہوئے بعض جانوروں اور زمین کی پیداوار کے ایک حصے کو اپنے خودساختہ معبودوں کے لئے مخصوص کر دیا اس طرح اپنی اولاد خصوصاً بعض بیٹوں کو قتل کر دینے کے احکام جاری کر دیئے اس سے دیوی اور دیوتا

خوش ہوتے ہیں۔ یہ ہدائتیں تھیں۔ اسی طرح بعض چار پاؤں پہ سواری یا ان سے کام لینے کو ممنوع قرار دے دیا اور بعض مردار جانوروں کا گوشت کھانا حلال ٹھہرا دیا اور بعض جانوروں سے استفادہ عورتوں کے لئے حرام کر دیا اور مردوں کے لئے حلال کر دیا (سورۃ نمبر:6، آیت نمبر:141۔137، پارہ:8، رکوع:3) اس قسم کے افترا پردازانہ احکام کا تذکرہ (سورۃ نمبر:5، آیت نمبر:103، پارہ:7، رکوع:4) اسی طرح یہودیوں کی اصلاح کے لئے وقتی طور پر جو حکم جاری کیا کہ ناخن دار جانوروں اور گائیوں اور بکریوں کی مخصوص چربیوں کا استعمال تمہارے لئے حرام ہے (سورۃ نمبر:6، آیت نمبر:147، پارہ:8، رکوع:5؛ سورۃ نمبر:4، آیت نمبر:107، پارہ:6، رکوع:2) اس قسم کے وقتی احکام کو بھی مذہب کا دائمی حکم ٹھہرا دیا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ منسوخ شدہ آیتوں سے قرآن کی آئتیں مراد نہیں' بلکہ پہلے مذہبی پیشواؤں کے من گھڑت احکام کا نسخ یعنی ملیا میٹ کرانا مراد ہے اور جن احکام خداوندی کو انہوں نے اپنی دین فروشی کے ماتحت دین فروشی کی غرض سے یعنی مذہبی سیادت کو قائم رکھنے کی غرض سے اپنے عوام کے دلوں سے ان کے نقوش تک مٹا دیئے تھے۔ میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور قرآن نے انمٹ اور ابدی احکام جن کے نقوش تک یہ مذہبی پیشوا مٹا چکے تھے۔ انہیں صحیح شکل وصورت میں کر دیا جنہیں تمام پیغمبر پیش کرتے رہے تھے۔ سب سے زیادہ زور قرآن نے شرک کے مٹانے پر دیا۔ جسے تمام پیغمبر اپنے اپنے وقت میں مٹاتے رہے وہ شرک شفاعت میں ہو یا عبادت میں ہو یا حکم میں ہو قرآن نے سارا زور اسی پر دیا ہے۔ قرآن نے ان کی خود ساختہ اور ان کے مذہبی دین فروش پیشواؤں کے احکام جو خدا کے نام پر پیش کرتے تھے جن سے وہ بگڑ کر معاذ اللہ آپ ﷺ پر افترا پردازی کی تہمتیں لگاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے (سورۃ نمبر:16، آیت نمبر:101، پارہ:14، رکوع:20) کہ جب بدلتے ہیں ہم کسی حکم کو ان کے خود ساختہ مذہبی احکام کی جگہ تو وہ چیخ چیخ کر یہ پکارتے ہیں ''کہ تو فقط افترا پرداز ہے اگلی چار آیتوں میں ان کی افترا پردازیوں کی مزید تفصیل فرمائی ہے اور (سورۃ نمبر: 22 کی آیت نمبر:52، پارہ:17، رکوع:14) بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان فرما دیا کہ ہم نے تم سے پہلے جب کبھی اپنا رسول بھیجا اور اس نے اپنی قوم کو میری آیتوں کے سنانے کا سلسلہ شروع کیا' تو شیطان سیرت مذہبی پیشواؤں نے آیات کے سلسلے میں اپنے مروجہ احکام کی آڑ لے کر ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ لیکن ہم نے ان کی رکاوٹوں کو ملیا میٹ کر دیا اور پھر اپنے رسول کے ذریعے دی ہوئی انمٹ ہدایتوں کو لوگوں کے دلوں میں مستحکم اور مضبوط منقش کر دیا اور پارہ پہلا سورۃ دو کے پہلے رکوع کی پہلی آیت میں مسلمانوں کو حضور ﷺ کے حق میں ذو معنی الفاظ استعمال کرنے کے لئے سختی سے مخالفت فرمائی' بلکہ اس کو کفر قرار دیا۔ رکوع کی دوسری آیت میں یعنی 105 میں اہل کتاب اور مشرکوں کو بدترین دشمنی اور افترا پردازی سے فراموش کرائے ہوئے کسی حکم کو فراموش ہو جانے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ تو ان سے بہتر یا ان جیسا حکم تمہارے ذریعے لوگوں کیسامنے پیش کرتے ہیں۔ یعنی ان کے افترائی احکام میں جو کسی موزوں شکل میں قائم رکھے جا سکتے تھے انہیں اچھی سے اچھی شکل دے کر پیش کر دیتے اور جو کسی ہیئت صورت' کیفیت کی تبدیلی کے قابل نہیں ہوتے۔ انہیں سرے سے مٹا کر ان کی جگہ بہتر سے بہتر احکام صادر فرما دیتے ہیں۔ خاکسار کی یہ تقریر میر محفل کے احترام کی وجہ سے نہایت خاموشی سے سنی گئی۔ مگر آپ (اقبال) نے فرمایا کہ

آیات قرآنی کے نسخ کا مسئلہ کیسے پیدا ہوگیا؟ خاکسار نے عرض کیا کہ نسخ پر مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں خود ان میں سے علمائے کرام کے ایک فریق نے یہ تسلیم کیا ہے ان آیات میں ان احکام کی نسخ کا ذکر ہے جو پہلی امتوں کے پاس من گھڑت مذہبی احکام یا وہ فروعات ہیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا تذکرہ آٹھویں یا پانچویں پارہ کی سابقہ آیات میں عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں قرآن نے پیش کی ہے (سورۃ نمبر:3، آیت نمبر:49، پارہ:3، رکوع:12) میں نے اپنی بساط کے مطابق اس مسئلے پر مسلمانوں کی جو کتابیں پڑھی ہیں۔ جن میں مشہور کتاب 'الناسخ والمنسوخ' الامام ابوجعفر النحاس المتوفی:338، ہجری مطبوعہ مصر (1323) اس کے بغور مطالعہ کرنے سے یہ چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

1۔ پورے قرآن میں کسی آیت کو دوسری آیت سے منسوخ کرنے کا تذکرہ تک نہیں۔

2۔ کسی آیت کے منسوخ ہونے سے متعلق یا ناسخ ہونے کے متعلق کوئی ایسی روایت (نہیں جو) صحیح ہو۔

3۔ صحابہ کرام کے نام پر موقوف روائتیں موجود ہیں، لیکن متضاد۔

4۔ پہلے پارے کی نسخ کی آیت کے ساتھ نسیان آیات کا بھی ذکر ہے جس کی خود قرآن کریم نے بڑے زوردار الفاظ میں تصدیق کردی ہے۔

خدا کی پڑھائی ہوئی آیتوں کے متعلق حضور ﷺ کا نسیان کا شکار ہونا خود قرآن کریم کے اعلان کے خلاف ہے (سورۃ:87، آیت نمبر:6، پارہ:30، رکوع:12)۔

5۔ منسوخ آیات قرآنی معاذ اللہ کی مخترع تعداد میں بے حد اختلاف ہے چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے (سورۃ احزاب:33) سورۃ بقرہ کے برابر تھی، حالانکہ سورۃ بقرہ کی آیتوں کی تعداد 286 ہے اور سورۃ احزاب کی صرف 73، جو سیکڑوں سے متجاوز ہوجانے کے بعد پھر گھٹنی شروع ہوئی۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب الاتقان میں ان کی منسوخ آیتوں کی تعداد بیس متعین کی اور انہوں نے اسے اپنی کتاب میں منظم شکل میں پیش کیا۔ ستائیسواں حصہ 314، بعض بزرگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے فرمایا کہ جابر کافروں کے ظلم وستم سہتے ہوئے صبر کرنے کا حکم دیا تھا ان ایک سو چوبیس آیتوں کو آیت سیف نے منسوخ کردیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ بعض بزرگ اس کار خیر میں عجیب بات لکھ گئے کہ (سورۃ نمبر:7 کی آیت نمبر:199، پارہ:9، رکوع:14) تین فقروں کی جو آیت ہے۔ ان میں سے دو فقرے منسوخ اور درمیانہ فقرہ غیر منسوخ۔

6۔ نسخ کا سوال آیات کے تضاد پر موقوف ہے اور قرآن کریم نے تضاد کی پوری نفی کردی ہے۔ بلکہ خود قرآن نے تضاد نہ ہونے کو اپنے کلام کی دلیل بنایا ہے (سورۃ نمبر:4، آیت نمبر:82، پارہ:5، رکوع:8) اور تضاد کے متعلق علم ادب وعلم منطق کا یہ فیصلہ ہے:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں وحدت موضوع و محمول ومکاں

(مبتدا وخبر)

وحدت شرط و اضافت جزو کل قوت و فعل است در آخر زماں

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اعلان فرمایا کہ اس اہم مضمون کی تکمیل آئندہ ملاقات میں ہوگی (یعنی آٹھ دن کے بعد) بعض جدید وقدیم تعلیم یافتہ بزرگوں نے عرض کیا کہ ہمیں چند سوالات پوچھنے کا موقع دیا جائے۔ تو آپؒ نے فرمایا کہ اس کا بھی اسی دن موقع ملے گا۔ یعنی آٹھ دن کے بعد:

سب سے پہلے ان بزرگوں نے اپنے افکار اور سوالات کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مجھے ارشاد فرمایا جس پر میں نے عرض کیا کہ ان بزرگوں کے ارشادات زیادہ تر اس بحث کے متعلق ہیں جو ہمارے پیشواؤں نے کتابیں لکھی ہیں' ان پر مبنی ہیں اور کسی بزرگ نے کسی آیت قرآنی کے نسخ کے متعلق نہ تو قرآن کریم کی کسی آیت کو پیش فرمایا ہے اور اپنی عقیدت مندی کی بنا پر غیر معصوم بزرگوں کے اقوال درج کئے ہیں ایک طرف تو وہ متضاد ہیں جو کسی ایک آیت کو منسوخ کہہ رہا ہے دوسرا اس کو ناسخ بتلا رہا ہے جس کی شہادت میں خاکسار اپنے ساتھ کتاب' الناسخ والمنسوخ' مصنفہ ابوجعفر نحاس متوفی 339 ہجری اور امام ابن خذیمہ کی کتاب' الناسخ والمنسوخ مطبوعہ مصر لے کر گیا تھا۔ ان کے صفحات پڑھ کر سنائے' جن میں سے ایک ایک آیت کے نسخ کے سلسلے میں بڑے بڑے اماموں کے پانچ پانچ اقوال ہیں جن پر ایک جگہ خود علامہ ابن نحاس نے یہ لکھا کہ کسی آیت قرآنی کو اس وقت تک منسوخ نہیں کہا جا سکتا جب تک کوئی دوسری آیت قرآنی جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے' اس کی ہر حیثیت سے متضاد نہ ہو (کتاب الناسخ والمنسوخ (12) اور یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی دو آیتوں کا ملنا محال ہے اور قرآن اسی عدم تضاد کو انمٹ احکام خداوندی کا مجموعہ ہونے کی دلیل ٹھہراتا ہے (سورۃ نمبر: 4، آیت نمبر: 82، پارہ نمبر: 4، رکوع: 8) اور ہمارے ان بزرگوں نے جن غیر معصوم بزرگوں کی کتابوں کو اعتماد کی سند دے رکھی ہے ان میں سے امام بخاریؒ کی ایک حدیث نقل کی ہے جو بظاہر موقوف ہے۔ حضرت عمرؓ پر وہ پیش فرمائی ہے۔ اگر اس کو مرفوع بھی فرض کیا جائے تو خود اس کے دونوں جملوں میں تضاد ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ شادی شدہ زناکاروں کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد ان کو سنگسار کر دیا جائے۔ لیکن میں اس پر بھروسا رکھ کر قرآن میں لکھوانا چاہتا ہوں اور نہ اس کے لکھنے کو حضور ﷺ نے پسند فرمایا۔ اس تضاد کی موجودگی میں اس غیر یقینی روایت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے اور قرآن میں موجود بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب قرآن کریم کی کوئی آیت یا سورت حضور ﷺ پر نازل ہوتی تھی تو ایک طرف تو معجزانہ رنگ میں حضور ﷺ کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف حضور ﷺ اسی قرآن کریم کی کتابت کرنے والوں میں سے جو بزرگ ڈیوٹی پر موجود ہوتے تھے ان سے لکھوا لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جب مکہ معظّمہ میں سرکار دو عالم پر سورۃ نمبر ۶ بیک وقت نازل ہوئی جس کی آیتیں ایک سو چھیاسٹھ ہیں اور رکوع بیس ہیں' اس وقت حضور ﷺ نے قرآن کریم کے جو کاتب ڈیوٹی پر تھے۔ اسی ترتیب سے پڑھ کر جس طرح خداوند کریم نے پڑھائی تھی لکھوا دی ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں یہ موجود ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی عدالت میں شادی شدہ زنا کار مرد اور عورت کو لائے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا کیونکہ حضور ﷺ نے ہر مذہب کی رعیت کو اجازت دے رکھی تھی۔ کہ ان کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا ان کے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا' تو حضور ﷺ نے

پوچھا کہ تمہاری مذہبی کتاب تورات میں اس جرم کی کیا سزا لکھی ہے تو انہوں نے غلط بیانی سے کام لے کر کہا کہ ہم اس کو کوڑوں کی سزا دیتے ہیں اور اسے رسوا کرتے ہیں۔ اسی محفل میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ موجود تھے۔ جو پہلے پکے یہودی عالم تھے۔ ان کی اس غلط بیانی کو وہ برداشت نہ کر سکے اور عرض کیا کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ تورات منگوائی گئی اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اس میں سے رجم کی آیت پڑھ کر سنائی۔ اس ثبوت کے مل جانے کے بعد حضور ﷺ نے تورات کی آیت رجم کے مطابق ان کو سزا دی۔ آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان بزرگوں نے جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ان میں کوئی ایک حدیث مرفوع صحیح تک موجود نہیں ہے۔ چہ جائیکہ قطعی ہو اور خود ان بزرگوں نے اپنے غیر معصوم مذہبی پیشواؤں کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ انہیں میں یہ درج ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اور نہ کسی آیت نے اس کو منسوخ کیا یعنی قرآن کی کسی آیت نے کسی آیت کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ کتابی اور غیر کتابی غیر مسلم جماعتوں کے گم راہ کن زر پرست مذہبی پیشواؤں نے اپنے من گھڑت احکام کو خدا تعالیٰ کے احکام کا نام دے رکھا تھا۔ اور دیدہ و دانستہ خدا پر افترا باندھتے تھے۔ جہاں تک جن انمٹ احکام کی خداوند کریم نے ہر رسول کے ذریعے ہر مذہب کی تعلیم دی تھی وہ بھی انہوں نے فراموش کر دی۔ چنانچہ سب سے بڑا حکم جو ہر نبی کے ذریعے خداوند کریم نے دیا وہ توحید فی الصفات توحید فی العبادت اور توحید فی الحکم کا حکم دیا تھا۔ وہ انہیں ایسا فراموش ہوا۔ کہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدا تعالیٰ کے صفات و عبادت و حکم میں شریک کر دیا (تفسیر اتقان تصنیف امام سیوطی شافعی 878 ہجری، مطبوعہ 1280ھ، مطبع احمدی دہلی صفحہ: 312-313-314) میں موجود ہے۔

اس گفتگو کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔

(5)26 کے الیکشن میں خاکسار بھی دوسرے مخلص ورکروں کی طرح شامل تھا تقریباً ہر انتخابی جلسے میں جہاں ملک لال دین قیصر لکے زئی اپنی شاعرانہ سحر بیانی سے ان محفلوں کو گرما دیتے تھے۔ خاکسار بھی اپنی استطاعت کے مطابق ان محفلوں کو آرائیں اور کشمیری برادری کے سوالات سے بالاتر رہنے کی تلقین کرتا تھا میں اس الیکشن کو اسلام اور کفر کا مقابلہ کہہ کر تعارف کراتا تھا۔ ملک محمد دین آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے اور علامہ اقبالؒ مرحوم کا تعلق کشمیری برادری سے تھا ان کو معلوم تھا کہ آرائیں برادری کے ووٹوں کی تعداد اس حلقے میں کشمیری برادری سے کہیں زیادہ ہے۔ اس واسطے میں آرائیں اور کشمیری تفرقے سے بالاتر رہ کر علامہ مغفور کی حمایت میں اپیل کرتا تھا۔ اس عرصے میں متعدد مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کیونکہ ہر رکن ان کے فرمان کے بموجب ہر روز اپنی اپنی کارکردگی پیش کرتا تھا۔ اور یہ روئداد سنتے تھے اور تبادلہ خیالات کرتے تھے ایک دن رات کے دس بجے ان کا نمائندہ خاکسار کے مکان پر تشریف لایا اور حکم دیا کہ آپ کو علامہ صاحب نے صبح یاد فرمایا ہے ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر بلوا بھیجنے کی حکمت معلوم ہوئی۔ بڑے مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں یہ سوال فرمایا کہ آپ نے خلافت کمیٹی کا عہدہ دار ہونے باوجود تحریک ہجرت کی مخالفت کیوں کی؟ میں نے عرض کیا کہ خاکسار اس تحریک کو گاندھی مہاراج کی ایک بدترین چال سمجھتا تھا' کہ جو ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں انہیں تو شدھ کر لیا جائے گا۔ باقی جو ہیں ان کو دیس

نکالا دے دیا جائے گا۔ کابل میں جا کر رہیں یا روس میں رہیں یا مکہ مدینہ جا کر رہیں۔ یہاں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں۔ ان کو یہ چیز بڑی ناگوار گزری۔ مگر مجمع میں سکون رہا اور میں نے عرض کیا کہ یہ ہجرت پر آمادہ کرنے والے بڑے معزز اراکین خود کیوں ہجرت نہیں فرماتے اور مجمع کو کہا کہ بلاشبہ ہجرت ناقابل برداشت مظالم کے وقت ایک مستحسن فعل ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ غیر مسلم حکومت کے ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آ کر دوسرے ملک میں جائیں۔ اس غرض سے جائیں کہ ہم اس ملک میں پناہ گزیں ہو کر قرآن حکیم کی انمٹ ہدایتوں کے مطابق باعزت زندگی گزاریں گے جس کی مثال ہجرت حبشہ ہے۔ حضور ﷺ نے بھی اس کی اجازت دے دی تھی۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ جب تک شدید ترین مظالم توڑنے والی حکومت بدل نہ جائے اور منصفانہ حکومت قائم نہ ہو جائے اس وقت تک اس ملک میں واپس نہ آئیں ورنہ یہی ہجرت ان کے لئے بدترین ابدی سزا کا موجب ہوگی۔ چنانچہ جہاں مہاتما گاندھی اور ان کے ہم خیال ہم مسلک ان کے چیلے مسٹر پٹیل اور پنڈت نہرو وغیرہ نے شدھی والوں کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو شدھ کرنے کے لئے امداد دی اور ہر صوبے میں، ہر بڑے شہر میں وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ جن میں سے ایک لاہور کا مشہور ترین فساد حویلی کا بلی مل متصل ڈبی بازار و چوک سرجن سنگھ بڑے وسیع پیمانے پر ہوا اور سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس فساد میں مسلمانوں نے کافروں کا رویہ اختیار کیا اور کافروں نے مسلمانوں کا یعنی جس پر ہاتھ اٹھاؤ اسے جان سے مار ڈالو۔ (سورۃ نمبر:4، آیت نمبر:4، پارہ:26، رکوع:5)۔

اس ناپسندیدہ روش کے نتیجے میں جن ہندو اور مسلمانوں کے چالان ہوئے۔ مسلمانوں ہی کی عدالتوں نے پھانسی کی سزا دی جن میں چنگڑ محلے کا مقدمہ دنیا میں مشہور ہے۔ انہیں ملک گیر فسادات کے دور میں جو مسلمان ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے۔ انہیں کابل کی سرحد پار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس پر علامہ اقبالؒ بہت ہنسے اور فرمایا کہ قبوں کے گرانے کے خلاف یہاں جو تحریک چلی تھی اس کی تم نے کیوں مخالفت کی۔ حالانکہ سب مسلمان ماتم منا رہے تھے اور تم اکیلے آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ نجدیوں کے جد اعلےٰ امام عبدالوہاب نجدی توحید کے مسئلے میں بڑے متشدد تھے اور یہاں تک کہ بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا بھی ان کے نزدیک مشرکانہ فعل تھا۔ ممکن ہے کہ اسی تشدد کے ماتحت شریف حسین جیسے لوگوں نے مزاروں اور ان پہ بنے ہوئے قبروں کی زیارت کو جانے والوں کو مشرکانہ حرکات سے متاثر ہو کر انہوں نے یہ کام کیا۔ کیونکہ نجدیوں سے پہلے حجاز کی امارت کا شرف شریف حسین کو تھا جا کا عرب ممالک میں ترکوں کا اقتدار ختم کرنے میں بڑا دخل تھا اور جو بدترین چال باز انگریز کرنل لارنس سال ہا سال تک اسلام کا مقدس لباس پہن کر ترکوں کے خلاف فضا سازگار کرتا رہا جسے یہ عرب عقل مندی سے شیخ کویت کے نام پکارتے تھے۔ جب حرمین شریفین میں وہ اسلامی لباس اوڑھ کر اسلامی رسوم کے طور پر نماز ادا کرنے کو آتا تھا۔ تو حرم شریف کی مسجد کے امام صاحبان اس کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ اور شریف حسین اور اس کے صاحبزادوں پر انگریز کا مطلب برآری کے بعد اعتماد نہ رہا۔ تو نجدیوں کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی شریف حسین کی کوئی سازش ہو۔ تاکہ ہند کے عوام نجدیوں کے خلاف

ہوجائیں۔اس طرح انگریز کی پھیلائی ہوئی خبروں متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تمام کی تمام صحیح ہوں۔مگران مشکوک خبروں سے متاثر ہوکر ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ تحریک اس وسیع پیمانے پر چل نکلی تھی کہ جگہ جگہ انگریز کو دفعہ 144 نافذ کرنا پڑی۔ اس لئے نجدیوں کی حمایت میں جومولانا ظفر علی خان نے جلسہ کرنا چاہا۔تو وہ جہانگیر کے مقبرے کے صحن میں ہوا۔خاکسار بھی تماش بین کے رنگ میں اس جلسے کو دیکھنے گیا مولانا ظفر علی خان مرحوم نے مجھے دور سے دیکھا تو اسٹیج پر بلالیا اور تقریر کرنے کی فرمائش کی میں نے وہاں مختصر تقریر کی جوزمیندار اور دوسرے اخباروں کے فائلوں میں محفوظ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

اگر نجدی والئ حرمین شریفین کی حیثیت سے' سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے اور ان مشرکانہ رسوم کو مٹانے کی کوشش کرنے تو سب سے پہلے ان مشرکانہ رسوم میں جو لوگ مبتلا تھے ان کے دلوں میں سے شرک اور کفر کے قبے گراتے تو ان سے مضبوط اور مضبوط تر قبوں کے مٹ جانے کے بعد وہ لوگ پتھروں' اینٹوں کے قبے خود مٹا دیتے۔نبوت کے اکیس سال کے بعد جب مکہ شریف فتح ہوا تو بعض مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ کعبے کی یہ عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی عمارت کے خلاف ہے۔خلیل اللہ کی عمارت کو کعبے کی موجودہ عمارت کے جس حصے کو باہر نکال دیا گیا ہے۔اسے حطیم کہتے ہیں۔اسے بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرز پر بنادیں۔جس طرح آپ ﷺ نے بتوں سے کعبے کو پاک کیا ے ارشاد فرمایا کہ یہ تعمیر اس وقت ہوئی جب میری عمر پینتیس برس تھی اور میں نے خود ایک مزدور کی حیثیت میں اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مجھے اس کے حصے کے چھٹ جانے کا علم ہے وجہ کا بھی علم ہے۔

چنانچہ حضور ﷺ کی بات سچی ہوئی تھی۔عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے حضور ﷺ کی رد کی ہوئی تجویز کے مطابق کعبے کو تعمیر کیا تا کہ لوگوں میں اسے مقبولیت حاصل ہو۔انکی فرضی مقبولیت کو حجاج بن یوسف نے خاک میں ملا دیا جہاں اس کی تحریک ختم ہوئی وہاں اس کی بنائی ہوئی کعبے کی عمارت بھی ختم ہوگئی' اور اس نے اس شکل میں اس کی تعمیر کرائی جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جس کی شکل بدلنے سے پرہیز فرمایا تھا۔اب تک موجود ہے۔

اس پر خاکسار نے یہ بھی عرض کیا کہ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ خاکسار کو دارالعلوم نعمانیہ ہند کی انتظامیہ کی طرف سے اس تقریر کی تردید کرنے کو کہا گیا خاکسار نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے نوٹس کی پشت پر لکھ دیا کہ آپ میرا استعفیٰ منظور فرمائیں۔چنانچہ استعفیٰ منظور ہوگیا۔اور میں ان طلبہ کو ساتھ لے کر بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد میں آ گیا۔ بھاٹی دروازے کے مخیر لوگوں نے ان کے لئے کتابیں مہیا کر دیا اور ان کے قیام اور طعام کا بھی بندوبست کر دیا۔جنہیں یہاں باقاعدہ درس دیا گیا۔جو کورس رہ گیا تھا اس کو مکمل کرنے کے لئے یہاں درس دیا گیا۔علامہؒ نے فرمایا کہ آپ نے اپنے مستقبل کا کیوں خیال نہیں کیا۔خاکسار نے حضرت علامہؒ کی ہمدردی کے اظہار پر عرض کیا کہ جو مسبب الاسباب مجھے چند روزہ زندگی عطا کرے گا۔ میری ضروریات کا بھی بندوبست فرمائے گا۔ان الفاظ پر یہ پانچویں ملاقات ختم ہوئی۔

(جاری ہے)

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خصوصی درس

عَبَسَ وَتَوَلّٰی

صاحبِ درس شیخ اللہ دتا کا تعارف ان کے ایک اور خصوصی درس ''فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡہُ بِبَعۡضِہَا ؕ'' کے ساتھ ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت ماہ اکتوبر 2020ء میں شائع کیا جا چکا ہے۔

آج جون 2018ء کی دس تاریخ ہے اور درس کا موضوع ہے قرآنِ کریم کی 80 ویں سورۃ عبَس کی آیات 1 تا 12 بالخصوص پہلی آیت عَبَسَ وَتَوَلّٰی (80:1)۔

قبل اس کے کہ اس بارے میں قرآنی اسلوب و معانی کی وضاحت کی جائے، چند ایک مروجہ تراجم سامعین کے علم میں لانا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو درجِ ذیل ہیں۔

قرآنی آیات:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے)

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾ وَمَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾ وَہُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ۚ﴿۱۰﴾ کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ ۚ﴿۱۱﴾ فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ﴿۱۲﴾

ترجمہ شیخ الہند محمود الحسن صاحب:

''تیوڑی چڑھائی اور مُنہ موڑا اس بات سے کہ آیا اُس کے پاس اندھا۔ اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا۔ یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا۔ وہ جو پروا نہیں کرتا۔ سو تُو اُس کی فکر میں ہے۔ اور تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ درست نہیں ہوتا۔ اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا اور وہ ڈرتا ہے۔ سو تُو اُس سے تغافل کرتا ہے۔ یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے۔ پھر جو کوئی چاہے اُس کو پڑھے۔''

ترجمہ فتح محمد خان صاحب جالندھری:

''(محمد مصطفٰے ﷺ) ترش رُو ہوئے اور مُنہ پھیر بیٹھے۔ کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا۔ جو پرواہ نہیں کرتا۔ اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو تم پر کچھ الزام نہیں۔ اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ اور (خدا سے)

ڈرتا ہے۔ اُس سے تم بے رُخی کرتے ہو۔ دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اسے یاد رکھے۔''

ترجمہ حکیم الامت اشرف علی صاحب تھانوی:

''پیغمبر چین بجبیں ہو گئے تو متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ اُن کے پاس اندھا آیا۔ اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا۔ یا نصیحت قبول کرتا تو اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا تو جو شخص بے پروائی کرتا ہے۔ آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں۔ حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور وہ ڈرتا ہے۔ آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔ ہرگز ایسا نہ کیجئے۔ قرآن نصیحت کی چیز ہے۔ سو جس کا جی چاہے اُس کو قبول کرے۔''

ترجمہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی (تفہیم القرآن):

''تُرش رُو ہوئے اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ (1) تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہوئے (2)۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔''

(1) لیکن کلام کی ابتداء اس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضور ﷺ نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے ''اس فعل کا صدور ہوا ہے۔ اس طرزِ بیان سے ایک نہایت لطیف طریقے پر رسول اللہ ﷺ کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کو جاننے والا اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رویے کا مرتکب ہو رہا ہے۔''

(2) ''یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن ام مکتومؓ کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی۔''

یہ ترجمے ''عَبَسَ وَتَوَلّٰی'' کا فاعل رسول اکرم ﷺ کو ٹھہراتے ہیں لیکن یہ ان کے شایانِ شان نہیں۔ شانِ نبوت کے منافی اس بیان کو حقیقت کے لباس میں پیش کرنے کے لئے مترجمین یہاں تک گئے ہیں کہ بقول امام رازی:

اجمع المفسرون علٰے ان الذی عَبَسَ وَتَوَلّٰی هوالرسول عليه الصلوٰة والسلام واجمعوا علیٰ ان الاعمیٰ هو ابنِ ام مكتوم۔

''گروہ مفسرین کا اجماع ہے کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی سے رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نابینا سے ابنِ ام

مکتوم مراد ہیں۔'' (اسے علامہ رحمت اللہ طارق نے تفسیر میزان القرآن صفحہ نمبر:359 میں تفسیر رازی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔)

ان روایتی ترجموں اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نہادِ ذہنی پر تبصرہ کرنے کے بجائے مناسب یہی ہے کہ ان پر امام حمید الدین فراہیؒ کی کتاب 'مجموعہ تفاسیر فراہی' (ترجمہ امین احسن اصلاحی) صفحہ نمبر 257، 258 سے ایک طویل اقتباس پیش کر دیں جو حسبِ ذیل ہے: (تفسیر سورۃ عبس)

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

''مجاہد سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ سردارانِ قریش میں سے کسی سے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ وہ قبول کر لے گا۔ اسی بیچ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آ گئے۔ آنحضرت ﷺ کی ان پر نظر پڑی تو آپ ﷺ کو ان کا ایسے وقت میں آنا ناگوار ہوا کہ یہ قرشی کہے گا کہ محمد ﷺ کی پیروی اسی قسم کے اندھے بہرے اور غریب و بے نوا لوگ کرتے ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

یہ تاویل حضرت مجاہد کی تاویل ہے۔ اور جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس واقعہ کے بارے میں بعض غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتومؓ نے آنحضرت ﷺ سے تعلیم وارشاد کی درخواست کی تھی اور آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔

اس قول کو وہ بعض اکابر سلف سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کسی قرشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتومؓ نے پہنچ کر درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے ان کی یہ بے توقع درخواست آپ ﷺ کو ناگوار ہوئی اور اس پر یہ آیت اتری۔ بعض لوگ انہی حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مجلس میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے سرداران قریش شریک تھے۔ بعض لوگ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ عتبہ بن ربیعہ، عباسؓ بن عبدالمطلب، ابوجہل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ نے آکر درخواست پیش کی کہ عَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھایئے) آپؐ کو ان کی بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ بعض لوگ حضرت ضحاک سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اشراف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ پہنچے اور انہوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ ایسے وقت میں آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچے کہ آپ عتبہ وشیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور روایت ابو مالک سے ہے کہ آپ ﷺ کی گفتگو امیہ بن خلف سے تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔

ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب روایتیں ایسے لوگوں سے مروی ہیں جن میں سے کوئی بھی

شریک واقعہ نہیں تھا۔ پس اگر ان کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہوگی، خبر کی نہ ہوگی۔ پھر ان میں باہم دگر اس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک طویل اختراع کی اور جھٹ اس کے لئے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کر دی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ باعتبارِ سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں، ان میں سے ایک روایت بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اور قرآن مجید سے بوجوہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

1۔ آیت کے الفاظ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نابینا کو دیکھ کر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترشرو ہوئے۔۔۔۔''

قبل اس کے کہ ہم زیرِ نظر آیات (80:1-12) کا اصل ترجمہ و مفہوم سامنے لائیں، شانِ رسالت، اور مؤمنین سے رسولِ خدا کے تعلق کے بارے میں اور منکرین کے متعلق ان کے رویہ کا انداز دیکھتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ کا اس بارے میں کیا ارشاد ہے۔

نبیٔ اکرم خُلقِ عظیم پر فائز تھے:

1۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ (68:4) شیخ الہند محمود الحسن صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خلق پر'' اس ترجمہ پر علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے حاشیہ لکھا ہے: ''پیدائشی طور پر آپ کی ساخت اور تربیت ایسی واقع ہوئی ہے کہ آپ کی کوئی حرکت اور کوئی چیز تناسب و اعتدال سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنے نہیں پائی۔''

یہ ترجمہ و تشریح دلیل حاصل کرتی ہے اس سے کہ آپ کے خلق کو عظیم کیا گیا ہے۔ یہ لفظ فَعِیل کے وزن پر ہے اور اس میں ہمیشگی اور دوام پایا جاتا ہے۔ آپ کا خلق عظیم تھا، عظیم ہے اور عظیم رہے گا۔ اس آیت کے پیشِ نظر آپ کے خلق کو ذمیم کہنا بہت بڑی جسارت ہے۔

2۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (3:159) ''سو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے جو تو نرم دل مل گیا اُن کو اور اگر تو ہوتا تند خو سخت دل تو متفرق ہو جاتے تیرے پاس سے۔'' یہ آیت بتاتی ہے کہ آپ ﷺ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى کے فاعل نہیں ہیں۔

3۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (15:88)

''اور نہ غم کھا ان پر اور جھکا اپنے باز وایمان والوں کے واسطے۔''

4۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (9:128)

''آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا۔ بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے، حریص ہے تمہاری بھلائی پر۔''

5۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ (6:52)

''اور مت دور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام چاہتے ہیں اسی کی رضا۔۔۔''

6۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (52:48)۔۔

''اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا، تُو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

7۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾
(26:219-217)

''اور بھروسہ کر اس زبردست رحم والے پر جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تو اُٹھتا ہے اور تیرا پھرنا ساجدین میں۔''

مندرجہ بالا آیات رسول اکرم ﷺ کی شان بیان کرتی ہیں کہ کس طرح وہ اللہ کو پیارے اور ہر آن اس کی نگاہوں میں ہیں اور خود نبی اکرم ﷺ مومنین کے ساتھ کس حد تک پیار و حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں اور مومنین کو اپنے سے دور کرنے یا ان سے ترش روئی سے پیش آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى (80:1) کا فاعل رسول کرم ﷺ کی ذات نہیں کوئی اور ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى کا اصل فاعل کون ہے؟ قرآنِ کریم نے اس کا نام نہیں لیا اور نہ ہی تعین فرمایا ہے۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ جہاں قرآن کریم غائب کے صیغے سے کوئی تذکرہ کرتا ہے تو کون مراد ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی آیات ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا ہے۔ سوال کرنے والے کون لوگ تھے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ (2:189) — ''تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا''

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ (2:219-215) — ''تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟''

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ (2:217)

''تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو کہ اس میں لڑنا کیسا؟''

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ (7:187)

''تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی کب ہوگا قیام اس کا۔''

يَسْئَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾ؕ (51:12)

''پوچھتے ہیں کب ہے دن انصاف کا؟''

يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ (33:63)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو، تو کہہ اس کی خبر ہے اللہ ہی کے پاس''

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ (4:127)

''اور تجھ سے عورتوں کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں۔''

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ (4:176)

''تجھ سے فتویٰ مانگتے ہیں، کہہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے''

مندرجہ بالا آیات میں بصیغۂ غائب سوالات کئے گئے ہیں لیکن سائلین کا تعین نہیں کیا گیا۔ صرف ہر آیت کے قرینہ سے سائل کو سمجھا جاسکتا ہے۔ البتہ ان حالات میں ایک جگہ وضاحت ہے کہ: يَسْئَلُكَ النَّاسُ ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں۔'' اس لئے جب کسی فاعل کا بصیغۂ غائب حوالہ آئے گا جس کا تعین قرآن نے نہ کیا ہو تو مراد ہوگا۔ ''لوگ سوال کرتے ہیں۔'' اور اگر صیغہ واحد غائب کا ہے تو ترجمہ ہوگا ''کسی نے یہ کہا۔ کوئی یہ کرتا ہے۔''

اب چونکہ ''عَبَسَ وَتَوَلّٰى'' میں فاعل کا تذکرہ یا تعین نہیں ہے تو ترجمہ ہوگا۔ ''کسی نے تیوری چڑھائی، اور کسی نے رُخ پھیرا''۔

اس سلسلہ میں قرآنی آیات نمبر: 31:25، 39:38، 43:9، 31:21، 17:85، 18:83، 20:105، 78:1 اور 12:7 کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

آیات زیر نظر (80:1-12) کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ان آیات میں آئے ہوئے الفاظ کے لغوی معانی اور آیات میں ان کے استعمال کا قرآنی اسلوب معلوم کرنا ضروری ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں:

1۔ عَبَسَ: سینہ کی تنگی سے چہرہ پر شکن پڑنے کو اَلْعَبُوْسُ کہتے ہیں۔ عَبَسَ: اس نے تیوڑی چڑھائی۔ اَلْعَبَسُ اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے بالوں کے ساتھ لگ کر خشک ہوجاتا ہے۔ عَبَسَ الْوَسْخُ عَلٰى وَجْهِهٖ۔ اس کے چہرے پر میل کچیل جم گئی (مفرداتِ راغب) نیز دیکھئے 74:22، 76:10۔ عَبَسَ، عَبُوْسٌ سے فعل ماضی۔

2۔ تَوَلّٰى، و۔ل۔ی۔ مادہ سے باب تفعل تَوَلِّیٌ سے فعل ماضی غائب بمعنی مونہہ پھیرنا۔ چہرے پر ناراضگی کا اظہار کیا اور رُخ پھیر لیا۔ (وَلّٰى متضاد المعانی ہے۔ رجوع کرنا اور اعراض کرنا دیکھئے (2:115؛ 2:137 اور 32-75:31)۔

3۔ اَلْاَعْمٰى: اَلَّذِيْ هُوَ اَعْمٰى (وہ جو اندھا تھا)۔ آیت (17:72) میں ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا رہا پس وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور راہ سے بہت دور پڑا ہوا)۔ لسان العرب کے مطابق فراء کا قول ہے کہ اس آیت میں اَعْمٰى کے معنی ہیں دنیاوی نعمتوں سے محروم۔ اَضَلُّ سَبِيْلًا جو شخص سیدھے راستے سے بھٹک کر غلط راہوں میں دور نکل جائے، وہ بھوک، پیاس، خستگی اور واماندگی جیسے صدہا مشکلات سے دوچار ہوجاتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔

آیت 13:19 میں ہے:

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾

(بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اُترا تجھ پر تیرے رب سے، حق ہے، برابر ہوسکتا ہے اس کے جو اندھا ہے۔ سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص قرآن کی حقیقتِ ثابتہ پر یقین نہیں رکھتا، وہ اَعْمٰی ہے۔

آیت 41:17 میں ہے: وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى۔

(اور وہ جو ثمود تھے ہم نے ان کو راہ بتلائی، پھر ان کو خوش لگا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے)

آیت 22:46 میں ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ

(سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، پر اندھے ہوجاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں۔)

مندرجہ بالا آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی رُو سے جو رسول اکرم پر اتاری ہوئی وحی کو حق نہیں سمجھتا، وہ اعمٰی ہے جو ہدایتِ خداوندی کے مطابق نہیں چلتا وہ اندھا ہے۔ ضروری نہیں کہ ماتھے کی آنکھیں اندھی ہوں، سینوں کے اندر دل اندھے ہوجاتے ہیں۔ ایسا شخص بالآخر دنیاوی نعمتوں سے محروم ہوجاتا ہے (20:124؛ 27:74-22)۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی مزید آیات مثلاً 6:50 اور 7:64 کا مطالعہ بھی فائدہ مند ہے۔

4۔ وَمَا يُدْرِيْكَ (33:63)

دَرْیٌ اور دِرَایَۃٌ سے باب افعال اِدْرَاءٌ کا فعل مضارع غائب۔ تجھے کیا چیز بتاتی ہے۔ دِرَایَۃٌ: کسی قسم کوشش یا تدبیر سے معلوم کرنا یا اس چیز کو معلوم کرنا جس میں پہلے شک ہو (طلب وقصد کے ساتھ تیزیٔ فہم)۔ مَا يُدْرِيْكَ: تجھے کیا چیز بتاتی ہے۔ قرآن کریم میں اس ترکیب کے بعد اس کے متعلق بیان نہیں کیا گیا بلکہ لَعَلَّ (شاید) کہہ کر پیشِ نظر بات کی گئی ہے۔ دیکھئے 42:17 جہاں کہا ہے وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (اور تجھے کیا چیز معلوم کرواتی ہے، شاید وہ گھڑی قریب ہو)۔ اور 33:63 میں ہے وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (اور تجھے کون سی چیز آگاہ کرتی ہے، شاید کہ وہ گھڑی قریب ہو۔ مَا يُدْرِيْكَ کی جگہ جہاں مَا اَدْرٰىكَ آیا ہے وہاں اس کا ترجمہ ہے ''تجھے کس چیز نے معلوم کروایا۔'' دیکھئے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ (97:2) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ (101:3) اور وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ (104:5)۔ ان سب جگہوں پر ترجمہ تو یہی ہوگا کہ تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ، الْقَارِعَةُ اور الْحُطَمَةُ کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ان سب مقامات پر آگے قرآنِ کریم نے بتادیا ہے کہ وہ کیا چیزیں یا حقائق ہیں۔

5۔ يَزَّكّٰى:

تَزَكِّيْ باب تفعل سے مضارع غائب یہ لفظ اصل میں يَتَزَكّٰى تھا۔ اس میں غائب مؤنث تَتَزَكّٰى کی ت کو زا بنا کر ادغام کیا۔ پھر اس کی موافقت کے واسطے باقی صیغوں میں بھی یہی قاعدہ جاری رکھا۔ معنی ہیں پاک ہونا (کمزوریاں رفع کرکے نشوونما پانا)۔ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى: شاید کہ وہ سدھر جائے۔

6۔یَذَّکَّرُ:

تَذَکَّرٌ سے مضارع غائب۔ یہ بھی یَتَذَکَّرُ تھا۔ سابقہ لفظ یَزَّکّٰی کی طرح اس میں بھی وہی قاعدہ ادغام جاری ہوا۔ اس کے معنی ہیں نصیحت حاصل کرنا۔ شاید وہ نصیحت حاصل کرے۔

7۔اَلذِّکْرٰی:

ذِکْرٌ کی طرح مصدر ہے۔ یاد کرنا۔ پس فائدہ دے اس کو نصیحت یا سمجھانا۔

8۔اَمَّا:

اس کا عمومی ترجمہ: اُسے پر، باقی رہا یہ کہ، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے، کیا جاتا ہے۔ یہ اَمَّا حروفِ شرط میں سے ایک ہے۔ یہ حرفِ تفصیل ہے یعنی ماقبل اجمال کی وضاحت کے لئے آتا ہے جہاں یہ فعل شرط اور حرفِ شرط کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اس کے جواب کو ''فَ'' لازم ہے۔ ''یہ کیونکر ممکن ہے''

(انگریزی میں کہیں گے: How Could it be that)

9۔اِسْتَغْنٰی:

اِسْتَغنا باب استفعال کا فعلِ ماضی ہے۔ بے نیاز ہونا۔ یعنی جس نے احتیاج نہ رکھی۔ بے پرواہوا۔

10۔فَاَنْتَ لَکَ:

اَنْتَ تُو واحد مخاطب مذکر کی ضمیر۔ اس سے قبل ضمیر کَ بطور مفعول آئی ہے (80:3) اور بعد میں جَآءَ کَ میں بطور ضمیر مفعول اور عَلَیْکَ میں بطور ضمیر مجرود (80:8، 80:7) اور فَاَنْتَ (80:10) میں آیا ہے۔ یہ اَنْتَ، ضمیر واحد مخاطب مذکر اور پھر کَ کی مفعول یا مجرور کی ضمیریں ہی بالعموم مفسرین اور مترجمین کے لئے وہ بنیاد سمجھی جاتی ہیں جن کی بنا پر رسول اکرم ﷺ کو عَبَسَ وَتَوَلّٰی یا بعد کے مذکور سارے بیان کا فاعل اور متعلق شخص قرار دیا جاتا ہے اور یہی وہ ضمیریں ہیں جو اس تذکرہ کو تمثیلی بیان ثابت کرنے میں رکاوٹ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ انداز کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔ آیئے قرآنِ کریم کی آیات سے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں:

قرآن کریم پوری نوعِ انسانی کی راہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے اور رسول کریم ﷺ کا اسے لوگوں تک پہنچانے کا انداز کیا تھا:

1۔وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (6:19) (اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اُسے جس کو وہ پہنچے۔)

2۔وَکَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (42:7)

(اور اسی طرح ہم نے تیری طرف قرآن عربی وحی کیا تاکہ تو بستیوں کے مرکز کو ڈرائے اور ان سب کو جو اس کے اردگرد ہیں)

3۔یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (10:57)

(اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے اور اس کے لئے شفا جو سینوں میں ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت۔)

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ (5:67)

(اے رسول ﷺ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتارا گیا ہے، پہنچا دے۔)

5۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ (16:125)

اپنے رب کے راستے کی طرف، حکمت اور اچھے وعظ سے بُلا اور اُن کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔

6۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ (12:108)

(کہہ دے یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے۔)

اس مقام تک جو بات ہوئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نوعِ انسانی کے ہر فرد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ قرآن کریم پہنچانے پر مامور تھے اور آپ اسے حکمت، موعظت، جدالِ احسن اور علیٰ وجہِ البصیرت پہنچاتے تھے اور یہی روش ان کو اختیار کرنا ہوگی جو آپ کے متبع ہیں۔

(چونکہ یہ درس ہے اس لئے تفصیلی آیات پیش کی گئی ہیں۔)

رہی بات اَنْتَ (ضمیر واحد مخاطب مذکر) کی تو قرآنِ کریم کے ماننے والوں کے لئے اتباعِ رسول ﷺ لازمی ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کے لیے الگ سے خطاب کیا جائے۔ رسول کریم ﷺ کو خطاب میں وہ بھی مخاطب ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

1۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ﴿۱۹﴾ (14:19)

(کیا نہیں دیکھا تُو نے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور لے آئے نئی خلقت۔)

اَلَمْ تَرَ واحد مخاطب ہے اور يُذْهِبْكُمْ کی ضمیر جمع مخاطب کی ہے۔ اس لئے اگرچہ اَلَمْ تَرَ میں تخاطب ایک فرد (رسول کریم ﷺ) سے ہے لیکن مراد پوری نوعِ انسانی ہے۔

2۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ (22:65)

(کیا نہیں دیکھا تُو نے کہ اللہ نے مسخر کر دیا واسطے تمہارے جو کچھ زمین میں ہے اور کشتیوں کو کہ جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہیں)

اَلَمْ تَرَ واحد مخاطب کا صیغہ ہے اور اس کے بعد ضمیر لَكُمْ جمع مخاطب کی ہے۔ اس لئے اَلَمْ تَرَ سے مراد بھی جمع مخاطب ہی ہے۔

3۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ ۔۔۔ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (65:1)

(اے نبی! جس وقت طلاق دو تم عورتوں کو پس دو تم ان کو ان کی عدت کے وقت کو' گنو تم عدت کو اور ڈرو اللہ اپنے رب سے۔۔۔نہیں جانتا تُو کہ اللہ پیدا کر دے پیچھے اس کے کوئی بات۔)

یہاں خطاب واحد ہے۔مخاطب نبی ﷺ ہے لیکن اس کے بعد تما صیغے جمع مخاطب کے ہیں۔۔۔اور جمع صیغوں کے بعد آیت کے اخیر میں پھر واحد مخاطب (تُو) کا صیغہ ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام احکام کا تخاطب عام ہے۔

4۔وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (17:23)

(اور تیرے رب نے حکم کیا ہے کہ تم اُس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔اور ماں باپ سے احسان کرنا۔اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہہ اور انہیں مت جھڑک اور ان سے تعظیم سے بات کر۔)

دیکھئے۔تخاطب واحد سے ہے (رَبُّكَ) لیکن اس کے لئے فعل (تَعْبُدُوْا) جمع کے صیغے میں ہے۔پھر عِنْدَكَ کی ضمیر واحد حاضر کی ہے اور اس کے بعد افعال بھی واحد حاضر کے ہیں۔ظاہر ہے کہ وَقَضٰى رَبُّكَ میں ''كَ'' واحد حاضر کی ضمیر کے باوجود نبیٔ اکرم ﷺ سے خاص تخاطب نہیں بلکہ ان ﷺ پر اس حکم کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔نبیٔ اکرم ﷺ کے والدین تو بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے۔اس لئے (رَبُّكَ) میں تخاطب عام ہے۔اسی لئے تَعْبُدُوْٓا میں جمع کا صیغہ ہے۔پھر واحد کے صیغوں سے بھی مراد جمع ہی ہے جیسا کہ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ (17:25) سے ظاہر ہے۔اسی سورۃ بنی اسرائیل کی بعد کی آیات خصوصاً (17:26، 17:28، 17:29، 17:31، 17:36، 17:37، 17:38) میں تخاطب کا صیغہ واحد (اٰتِ، تُعْرِضَنَّ، فَقُلْ، وَلَا تَجْعَلْ، فَتَقْعُدَ، لَا تَقْفُ، لَا تَمْشِ، لَنْ تَخْرِقَ اور كَ کی ضمیریں وغیرہ آئی ہیں۔اور ترجمہ میں واحد مخاطب کا انداز اختیار کیا جائے گا لیکن مراد جمع ہے جیسے دیگر آیات میں صیغے جمع مخاطب کے استعمال ہوئے جیسے لَا تَقْتُلُوْا، لَا تَقْرَبُوْا، ولا تَقْتُلُوْا، ولا تَقْرَبُوْا، اَوْفُوْا، وَزِنُوْا وغیرھا۔ان سب مقامات میں آیت نمبر 17:23 کی طرح واحد مخاطب کے صیغوں سے مراد بھی جمع ہی ہے۔حتیٰ کہ آیت: ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (17:39)

(یہ حکمت کی ان باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کیا ہے اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود مت ٹھہرا کہ تُو دوزخ میں ڈالا جائے ملامت کا مستوجب اور ٹھکرایا ہوا۔)

اس آیت میں مخاطب واحد ہے اور آیت کے پہلے حصے سے ظاہر ہے کہ تخاطب خود رسول ﷺ سے ہے۔لیکن آیت کے دوسرے حصہ میں مخاطب واحد نہیں ہوسکتا۔رسول ﷺ کی وساطت سے عام تخاطب ہے۔

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں:

1۔واحد مخاطب سے مراد جمع مخاطب ہے اور

2۔رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے حکم عام دیا گیا ہے، اس لئے رسول ﷺ سے تخاطب بھی عام تخاطب ہے۔

سورہ عبس میں عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے فاعل رسول ﷺ نہیں ہیں اور مَا یُدْرِیْكَ اور بعد میں مخاطب واحد مذکر کی ضمیریں انت اور مفعول کی ضمیر ک اور ضمیر مجرور ک میں تخاطب رسول ﷺ کی وساطت سے عام ہے اور ایک رویہ کو تمثیلی انداز سے سمجھایا گیا ہے۔جس کی وضاحت كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (80:11) کہہ کے کر دی گئی ہے۔امام حمید الدین فراہیؒ جن کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے، لکھتے ہیں کہ ''قرآن مجید نے تعلیم کو مؤثر اور دلنشین بنانے کے ئے، نابینا کے مناسبِ حال واقعہ کو بطورِ مثال اختیار کر لیا ہے۔''

مندرجہ بالا ضمیروں سے مذکورہ بیان کو خصوصی طور پر رسول کریم ﷺ کی طرف موڑنے کی دلیل کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ بیان مسلسل ہے اس لئے عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے فاعل بھی رسول کریم ہی ہیں (مَعَاذ اللہ) آیۂ زیر بحث کے متعلق اس دلیل کا جائزہ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی کتابِ تفسیر ''برہان القران'' میں لیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''آیۂ زیرِ بحث کا اگر فنی جائزہ لیا جائے تو پورا واقعہ ایک تمثیلی واقعہ بن جاتا ہے اور رائج تفاسیر کی مکمل نفی کر ڈالتا ہے کیونکہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ؕ تک سلسلۂ کلام غائب کے لہجے میں اور مَا یُدْرِیْكَ سے سابقہ آہنگ (Tone) بدل کر صیغۂ خطاب سے بات کا رُخ نبی اکرم ﷺ کی طرف موڑ دیتا ہے اسے فنِ معانی میں التفات کہا جاتا ہے۔جیسے الحمد سے مالک یوم الدین تک غائب اور ایاک نعبد سے آخر تک خطاب کے صیغے سے بات کر کے التفات کا احساس دلایا ہے۔اسی طرح وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ میں ہٗ کا ضمیر ابن اُم مکتوم کی طرف نہیں پھرتا کہ وہ تو پہلے ہی سے مزکی اور ہدایت یافتہ تھے۔یہاں کسی ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے جو آنکھوں سے بینا مگر دل کا اندھا، اور طلبِ ہدایت کے لئے دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی اس طرح الاعمٰی ''حقیقی'' اندھے پن کا غماز نہیں، اس کے کفر کا استعارہ ہے۔ فُصِّلَت میں فرمایا فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی انہوں نے اسلام پر کفر کو ترجیح دی۔(41:17)

(انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنے کو پسند کیا)۔

11۔تَصَدّٰی:

دراصل تَصَدّٰی کلمہ تَتَصَدَّدَ تھا۔یہ صدد سے بابِ تفعل سے فعل مضارع ہے جس کے معنی متوازی اور متقابل کے ہیں اور تَصَدّٰی کے معنی ہیں درپے ہونا۔تو اس کے درپے ہے۔

12۔وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی

(اور اگر وہ سدھرنا نہ چاہے تو اس کا بارِ الزام تم پر نہیں، یہ تمہاری ذمہ داری نہیں)۔

13۔یَسْعٰی:

''وہ دوڑ کر آتا ہے۔'' (نابینا تو دوڑ کر نہیں آتا وہ تو آہستہ سہارے سے یا ٹوہ ٹاہ کر آتا ہے)۔دوسری طرح دیکھیں تو یہ دل کے بے تابانہ شوق کے لئے ایک پُر کنایہ طریقہ تعبیر ہے۔

14۔ وَهُوَ يَخْشٰى:

''اور وہ ڈرتا ہے۔'' اشارہ سابقہ سورۃ النّٰزعٰت کی آیت اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا (79:45) کی طرف ہے کہ ''آپ ﷺ تو صرف اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو السّاعۃ سے ڈرتا ہے۔''

15۔ عَنْهُ تَلَهّٰى:

یہ کلمہ بھی دراصل تَتَلَهّٰى تھا۔ حسبِ قاعدہ اوغام کے بعد تَلَهّٰى ہوگیا۔ بابِ تفعل سے فعل ماضی۔ اس کے معنی ہیں ''تُو اس سے غافل ہوگیا۔'' اس کی طرف توجہ نہ کرسکا۔

16۔ كَلَّا

یہ حرفِ ردع یا زجر ہے جس کے معنی ہیں ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں جھڑکنے متنبہ کرنے یا باز رکھنے اور مذمت کرنے کا پہلو ہوتا ہے لیکن اہلِ معانی کے نزدیک اس کے صرف یہی معنی نہیں ہوتے۔ اس کلمہ کے مذکوہ معنی اس وقت ہوتے ہیں جب كَلَّا کے بعد وقف ہو یا اس کا لاحقہ بل اور لِ ہو جیسے:

1۔ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ (34:27)

(کہہ دے مجھے وہ لوگ دکھاؤ جنہیں تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ ملایا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہی اللہ سب پر غالب بڑی حکمت والا ہے۔)

2۔ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾ (74:52-53)

بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیئے جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔

3۔ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ (80:23)

(ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا)

4۔ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾ (96:15)

(ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور اسے پیشانی کے ان بالوں کے ساتھ گسیٹیں گے)

5۔ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿۴﴾ (104:4)

ہرگز نہیں، وہ ضرور حُطَمَۃ میں پھینکا جائے گا۔

كَلَّا کے مندرجہ بالا معنی اور شرائط کے لئے دیکھئے مزید آیات (75:20، 76:26، 82:9، 15 ۔83:14، 96:15) وغیرھا۔

كَلَّا مندرجہ صورت میں نہ آیا ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے ''حقیقت یہ ہے'' حَقًّا۔ مثلاً

6۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ﴿۶﴾ (96:6)۔

سچ مچ بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے۔

7۔ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ (83:7)

بے شک کافروں کی لکھت سب سے نیچی جگہ سِجّین میں ہے۔

حقا کے علاوہ اس کا ترجمہ ''ہاں ہاں بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً

8۔ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (83:15)

ہاں ہاں بے شک وہ اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم ہیں۔

9۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ (102:3-5)

ہاں ہاں تم جلد جان جاؤ گے۔ پھر ہاں ہاں تم جلد جان جاؤ گے۔ ہاں ہاں اگر یقین کا جاننا جانتے۔

قرآن کریم کے مندرجہ بالا حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ كَلَّا کا ترجمہ ہر جگہ ''ہرگز نہیں یوں'' نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ شرائط کے مطابق اس کا ترجمہ حقّا، یہ حقیقت ہے اور ہاں ہاں دیکھو بھی ہوتا ہے۔

زیر درس آیت نمبر 80:11 میں آیت کے الفاظ کو دیکھیں تو یہ كَلَّآ اِنَّهَا ہیں۔ اس کے بعد کوئی وقف نہیں اور بلکہ یا ل کا لاحقہ بھی نہیں تو اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ ایسا ہرگز نہ چاہئے۔'' درست نہیں۔ اس کا ترجمہ ہوگا ''حقیقت یہ ہے، حق بات یہ ہے، واقعہ یہ ہے۔''

17۔ اِنَّهَا:

یہ ضمیر جملہ کے ابتداء میں آتی ہے۔ اسے ضمیر قصہ کہتے ہیں۔ چونکہ اس سے پہلے کوئی اسم نہیں ہوتا اس لئے اس کو عام جملہ یا اس کے مفہوم کی طرف راجع سمجھا جاتا ہے۔

اگر ایسی ضمیر مذکر کی ہو جیسے اِنَّهٗ تو اسے ضمیر الشان کہتے ہیں جیسے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ (86:13) (یقیناً یہ ایک دوٹوک بات ہے)، اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (28:37) (حقیقت یہ ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہوتے) اور اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (23:117) (حقیقت یہ ہے کہ کافر فلاح نہیں پائیں گے)۔

زیر نظر آیت میں اِنَّهَا ضمیر قصہ ہے معنیٰ یہ ہوگا کہ مذکورہ بات جو ہے وہ (تذکرہ) ہے۔

18۔ تَذْكِرَةٌ:

وہ شے جس سے کوئی دوسری خاص شے یاد آجائے تو پہلی شے اس دوسری شے کے لئے تذکرہ ہوگی۔ نشانی، یادگار، نصیحت، یادداشت، ضرورت کو یاد دلانے والی چیز۔ کوئی شے یاد رکھنے، نہ بھولنے کے لئے جو ذریعہ بنائی جائے، اسے تذکرہ کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے:

1۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (73:19)، (76:29)

(بے شک یہ نصیحت ہے سو جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔)

2۔ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (69:48)

(اور یقیناً یہ (قرآن) متقیوں کے لئے نصیحت ہے)

3۔ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ (55-74:54)

(ہاں ہاں بے شک وہ نصیحت ہے سو جو چاہے اس سے نصیحت لے)۔

قرآنِ کریم کی آیات (12-80:1) میں جو کلمات آئے ہیں یا جو تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ ان کے الگ الگ معانی اور تجزیاتی مفاہیم آپ نے ملاحظہ کئے۔ ان تشریحات کے پیشِ نظر آیات مذکورہ کا ترجمہ درجِ ذیل ہوگا۔

قرآنِ کریم کے جن مقامات سے ان آیات کے ترجمہ میں استفادہ کیا گیا ہے، وہ نیچے فٹ نوٹ میں درج کر دیئے گئے ہیں۔)

''اللہ تعالیٰ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

1۔ کسی خوشحال متکبر نے رعونت سے تیوڑی چڑھائی اور کسی نے استھزاء اور نفرت سے مونہہ پھیرا۔ (ا)

2۔ یہ کہ آیا اس کے پاس وہ شخص جو خستہ حال، وحی سے نا آشنا ہونے کے باوجود، ڈر والا اور جستجو میں تھا۔

3۔ اس آنے والے کے متعلق اے پیغمبر آپؐ (تیری اتباع میں ہر قرآنی مبلغ) کو کیا چیز معلوم کرواتی ہے کہ شاید وہ (قرآنی تعلیم سے) سنور جائے۔

4۔ وہ اسے سمجھ لے تو یہ نصیحت اسے فائدہ پہنچائے (وہ ایمان لے آئے)۔ (ب)

(دو طرح کے مخاطب سامنے آنے سے دو مختلف رویّوں کا تقاضا ہوا)۔

5۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسا شخص جو دولت کے گھمنڈ میں سمجھتا ہے کہ اسے اس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے نہ پرواہ۔

6۔ تو آپؐ اس کے پیچھے اپنی جان کھپائیں۔ (ج)

7۔ حالانکہ آپؐ پر (کوئی الزام) نہیں کہ وہ نہ سنورے۔ (د)

8۔ اور وہ شخص جو قرآن سمجھنے کے لئے بھاگتا ہوا تمہارے پاس آیا۔

9۔ اور وہ غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے ڈرتا بھی ہے۔

10۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ آپؐ اس سے رُخی برتیں۔ (ط)

11۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بات سمجھانے کا ایک انداز ایک مثال ہے،

اس میں ایک نصیحت ہے (کہ قرآنی مبلغ کا رویہ کیسا ہونا چاہئے)۔

12۔ تو جو شخص بھی چاہے (اپنی مرضی سے اس کو سمجھے، ایمان لا کر شرف حاصل کرے۔ (ع)

یہ ہے آیات (13-80:1) ترجمہ قرآنی اسلوب اور عربی مبین کے مطابق۔

(وما توفیقی الا باللہ العظیم)

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ

(ا) 36:30؛ 97-15:94-23-74:22۔ (ب) 51:55۔ (ج) 18:6؛ 26:3۔ (د) 51:54

(ط) 54-6:52۔ (ع) 18:29؛ 73:19؛ 55-74:37؛ 43:44؛ 51:55

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوّف

جس کے سارے عقائد قرآن کے خلاف ہیں

20 جنوری 2020ء کے اخبار روزنامہ ''دنیا'' میں ایک مضمون بعنوان ''کیا تصوّف کو نصاب کا حصہ ہونا چاہئے'' طبع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مصنف محترم جناب عامر خاکوانی صاحب ہیں۔ اس مضمون میں تصوّف کے چند نظریات وکوائف تحریر کئے گئے ہیں۔ ہمارے دل میں جناب عامر خاکوانی صاحب کی عزت ہے۔ روایتی صوفی حضرات جب بھی تصوّف کے متعلق کچھ تحریر کریں گے، وہاں ان ہی نظریات کا ذکر آئے گا۔ ہمارا ارادہ اس مضمون کا صرف تعارف کرانا ہے۔ اصل گفتگو نفس تصوّف کے موضوع پر کی جائے گی کہ تصوف کے سارے عقائد قرآن کے خلاف ہیں اور یہ ختمِ نبوت سے انکار اور اجرائے نبوت کی ایک ناکام کوشش ہے جس میں وحی کی جگہ الہام اور معجزہ کی جگہ کرامات رکھ دی گئی ہیں۔ اپنے مضمون میں خاکوانی صاحب نے تین سوال اٹھائے ہیں۔

1۔ تصوّف کیا ہے؟

2۔ آج کے دور میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

3۔ اور تیسرا سوال یہ کہ اس کو نصاب کا حصہ کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

ان سوالات کے جواب عرض کئے جاتے ہیں۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ تصوّف کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک باطنی Subjective چیز ہے۔ صوفیاء حضرات خود کہتے ہیں۔ ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔ بظاہر تصوف روح کے تزکیہ کا نام ہے اور اس کا طریقہ علائق دنیا کو زیادہ سے زیادہ ترک کرنا ہے، ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولا، ترکِ ترک واضح رہے کہ قرآنِ کریم روحِ انسانی کا قائل نہیں ہے۔ قرآن میں نہ تو روحانیت ومعرفت کے الفاظ آئے ہیں اور نہ قرآن نے روحانیت اور معرفت کا مطالبہ کیا ہے۔

آج کے دور میں تصوف کی کیا اہمیت ہے۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر دور کی انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے

اور یہی اس کا وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ اگر تصوف اس دور کے مسائل حل کرتا ہے تو اس کی اہمیت ہے ورنہ۔

ایں کلام صوفیانِ شوم نیست مثنوی مولویِ روم نیست

اگر یہ مسلمانوں کی حالت درست نہیں کرتا، تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اسے داخل نصاب نہیں کرنا چاہئے۔

محترم خاکوانی صاحب نے فرمایا کہ تصوف کو سمجھنا بہت آسان بات ہے۔ لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ اس کو سمجھانے کے لئے بڑی دقیق کتب تحریر کی گئی ہیں۔ جن کا حوالہ خود جناب خوکوانی صاحب نے دیا ہے۔ فصوص الحکم، قوت القلوب، عدارف المعارف، کشف المحجوب۔ اگر تصوف اس قدر آسان ہے تو اس کے سمجھانے کے لئے اتنی دقیق کتابوں کی کیا ضرورت ہے؟ پھر ان کتابوں کی مزید شروح کی گئی ہیں۔

محترم مصنف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ تصوف مسالک و شریعت کے راستے پر خوش اسلوبی سے سفر کرنے کی تربیت دیتا ہے۔ جس شریعت پر چلنے کی تصوف تربیت دیتا ہے، اس شریعت کے لئے ہماری گذارش ملاحظہ فرمائیں۔

قرآنِ کریم کے پیش نگاہ ایک مملکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو چلانے کے اصول عطا فرماتا ہے۔ چونکہ یہ مملکت مختلف ادوار میں جاری رہے گی۔ اس لئے قرآنِ کریم میں زیادہ تر اصول عطا کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات مختلف ادوار میں، مختلف ماحول کی وجہ سے تبدیل ہوتی جائیں گی۔ اپنی ریاست مدینہ میں حضور ﷺ اس کے سربراہ تھے اور اولوالامر اس کے مقامی حکام تھے۔ قرآن کی رُو سے مقامی حکام کی اطاعت بھی فرض تھی (4:59) احکام حضور ﷺ کو ملتے تھے۔ آپ ان کی جزئیات مقرر فرما کر، مقامی حکام کو ان جزئیات سے آگاہ فرما دیتے تھے۔ قرآن کریم نے ایتائے زکوٰۃ کا حکم صادر فرمایا۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کے مطابق اس کا ایک نصاب بنا دیا جس پر خود حضور ﷺ اور اولوالامر عمل کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے نکاح کے لئے بلوغت شرط رکھی ہے (4:6)، بلوغت کو Define کر کے حضور ﷺ نے نکاح کی عمر مقرر فرما دی۔ قرآن کریم نے نکاح کے لئے مہر کو شرط قرار دیا ہے۔ لیکن خود اس کی رقم بیان نہیں کی۔ حضور ﷺ نے مہر کی رقم مقرر فرما دی۔ حضور ﷺ جو وحی کے ذریعے اصول حاصل کر رہے تھے خود ان کی جزئیات مقرر فرماتے جا رہے تھے۔ اسلامی مملکت میں اصولوں کی جو جزئیات مقرر کی جاتی ہیں وہ شریعت کہلاتی ہیں۔ غیر اسلامی حکومتوں کی مقرر کردہ جزئیات شریعت نہیں ہوتی ہمارے ہاں جو قوانین شریعت کہے جاتے ہیں، یہ بنو عباس کے دور میں وضع ہوئے جو غیر اسلامی حکومت تھی۔ جو بادشاہوں کے زیر اثر فقہاء حضرات نے وضع کئے۔ یہ قوانین فقہاء حضرات کی ذاتی آراء تھیں۔ غیر اسلامی حکومت میں اسلامی قانون، وضع نہیں ہو سکتے۔ ہماری شریعت غیر اسلامی حکومت میں وضع ہوئی اس لئے یہ اسلامی شریعت نہیں ہے۔ تصوّف اگر اس شریعت پر چلنے کی تربیت دیتا ہے تو کوئی قابل رشک کام نہیں۔ البتہ اگر تصوف قرآنی احکامات کے مطابق شریعت وضع کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اس پر مسلمانوں کو عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا، تو وہ قرآن کی خدمت ہوتی۔

مضمون میں یہ بھی تحریر ہے ''تصوف کے سکول آف تھاٹ میں آنے والے شخص کی ذاتی کمزوریوں کو دور کرنے کی

کوشش ہوتی ہے۔ کینہ، بغض، خودغرضی، چغلی، بخل وغیرہ جیسے امراض کو دور کر کے ایثار کی تربیت دی جاتی ہے اپنے نفس کو قابو کرنے کی مشق، اپنی بھوک روک کے اپنی آدھی روٹی کسی دوسرے بھوکے کو کھلانے کا ایثار، سب سے زیادہ اللہ کی بندگی کے احساس کو بھرپور بنا دینا۔ یہ تصوف ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ صاحبِ مضمون نے جو تحریر کیا ہے کہ تصوف سے ان سب عیوب کا علاج ہوجاتا ہے تو کیا آنجناب کا یہ خیال ہے کہ قرآن کریم ان عیوب کی مذمت نہیں کرتا۔ جو شخص بھی قرآن کی اطاعت کرے گا، وہ ان سب عیوب سے دور ہوجائے گا۔

جہاں تک صاحب مضمون نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ تصوف اللہ کی بندگی کے احساس کو بھرپور بنا دیتا ہے تو اس میں ایک اشکال یہ ہے کہ بندگی کے دو معنی ہوتے ہیں۔ فارسی میں لفظ بندگی کے معنی اطاعت کرنا ہوتے ہیں اور ہندی میں اس کے معنی پرستش کرنے کے ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء عمداً عبادت کے معنی محکومی کے نہیں کرتے کیونکہ اس طرح بات صاف اور واضح ہوجاتی ہے اور اسلامی حکومت کا قائم کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ بندگی کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی مراد پرستش کرنا ہوتی ہے۔ محکومیت نہیں ہوتی۔ ہماری بدقسمتی کہ تصوّف میں روح انسانی کا تصور بہت غالب ونمایاں ہے اور روح کا تزکیہ اور روحانیت کا بڑھانا زندگی کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ روحانیت کو معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ جنگلوں، پہاڑوں، گوشوں، زاویوں میں پرستش کرنے اور مجاہدوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے تصوف اللہ کی پرستش کے احساس کو بھرپور بنا دیتا ہے یہ اللہ کی محکومیت کے احساس کو ترقی نہیں دیتا۔ تصوف میں پرستش اللہ کی ہوتی ہے اور محکومی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی ہوتی ہے، اور یہ شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30:32) فرقہ بندی کرنے والے کا رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں رہتا (66:159)، جو شخص فرقہ بندی کرتا ہے وہ قرآن کی رو سے دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ مسلمان اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کریں۔ سارا کاروبار سودی ہے۔ جو اللہ ورسول کے خلاف جنگ کرنا ہے (2:279)۔ ہمارا سارا رزق حرام، ایک ایک لقمہ حرام مال کا ہے۔ ہم جو کپڑے پہن رہے ہیں، قمیص، شلوار، جوتیاں یہ سب چیزیں اُن کارخانوں میں بنی ہیں جو سودی رقوم پر چل رہے ہیں۔ ہماری حکومت ورلڈ بینک اور دیگر بین الاقوامی اداروں سے سود پر رقم حاصل کرتی ہے۔ کیا حرام مال کھانے والوں، دائرہ اسلام سے خارج لوگوں کی روح کا تزکیہ ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کی تباہی اور ان کی بربادی کا اصل سبب ہی تصوف اور پرستش ہے۔ اور اس کا واحد حل دین کی اقامت ہے۔ جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ فی الحال ہم تصوف کے خلاف قرآنی عقائد کو پیشِ خدمت عالی کرتے ہیں۔

1۔ قرآن نے تقریباً 15 مقامات پر ارشاد فرمایا ہے کہ یہ کائنات ازخود وجود میں نہیں آ گئی اس کو بالحق پیدا کیا گیا ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط (6:73) بِالْحَقِّ اتنا جامع لفظ ہے کہ اس کا مفہوم بیان کرنے کے لئے وقت درکار ہے۔ سوچی سمجھی سکیم کے مطابق، ایک منزل مقصود کی طرف لے جانے کے لئے اس آیۂ کریمہ نے بہت سے غلط

عقائد کی تردید کردی۔ سب سے اہم واساسی نظریہ تو وہ ہے جس پر تصوف کی ساری عمارت استوار ہے، یہ وحدت الوجود کا عقیدہ کہ یہ ساری کائنات فی الحقیقت موجود ہی نہیں ہے۔ یہ صرف انسان کا خیال ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

اسی شاعر نے کہا:

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ، ہے، نہیں ہے

وحدت الوجود کا عقیدہ ہی روحانیت کا عروۃُ الوثقیٰ بن گیا۔ تصوف کی ساری عمارت اس عقیدہ پر قائم ہے کہ کوئی چیز بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ بس صرف خدا کا وجود ہے یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔ تصوف کا یہ پہلا اور اساسی عقیدہ ہے جو قرآن کے خلاف ہے جو قوم کائنات کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتی۔ وہ تسخیرِ کائنات بھی نہیں کرے گی اور قدرت کی قوتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس عقیدہ کی وجہ سے مسلمان سائنس کے میدان میں سب سے پیچھے ہیں اور یہ عقیدہ مسلمانوں کے زوال کا سبب بھی ہے۔

تصوف کے اس عقیدہ وحدت الوجود کو نصاب میں شامل کرنے سے آپ خود غور کریں کہ بچوں کے دماغ پر کیا اثر پڑے گا۔ قرآن نے فرمایا: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ (38:27) ہم نے زمین اور آسماں کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اس کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے کفر کیا۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآنِ کریم نے کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف منفیانہ تصور رکھنے والوں کو کافر کہا ہے۔ ہمارے سارے تصوف کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے۔

(2) تصوف کا دوسرا عقیدہ جو قرآن کے خلاف ہے وہ حصول علم کے متعلق ہے۔ قرآن نے ارشاد فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (17:36)۔ ترجمہ اور جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو (خواہ مخواہ) اس کے پیچھے نہ پڑیں کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان سب کی یقیناً باز پرس ہوگی۔ قرآنِ کریم علم اس کو کہتا ہے جو انسانی حواس کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت بصارت اور فواد پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف تصوف میں جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس میں حواس انسانی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حصول علم کے بارے میں تصوف قرآن کا نظریہ چھوڑ کر افلاطون کے نظریہ کی پیروی کرتا ہے۔ جو بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ دنیائے محسوسات (اس ہماری کائنات) کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو اس کا حاصل شدہ علم بھی یقینی نہیں ہوسکتا۔ اصل دنیا ایک اوپر کی دنیا ہے۔ یہ حقیقی دنیا عالم امثال کی دنیا ہے۔ اور یہ کہیں عالم افلاک میں واقع ہے یہ ہماری دنیا، اس عالم امثال کی دنیا کا سایہ ہے۔ اس کا عکس ہے اور عالم امثال کا علم باطنی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ اندر کے دل کو روشن کرنے سے وہ علم حاصل ہوتا ہے باطنی ذرائع سے حاصل کردہ علم یقینی اور قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ تصوف کے اس بنیادی نظریہ کا منطقی نتیجہ ظاہر ہے۔ جب یہ کائنات اپنا

وجود ہی نہیں رکھتی، بلکہ صرف سراب ہے تو جو علم حواس کے ذریعے حاصل ہوگا وہ بھی نہایت غیر معتبر ہوگا۔ اسی لئے مولانا روم نے فرمایا تھا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکین بود
گر بہ استدلال کارے دین بُدے فخر رازی، راز دارِ دین بود

تصوف علم بالحواس کو Condemn کرتا ہے اور صرف باطنی ذرائع سے حاصل کردہ علم کو قابلِ بھروسہ گردانتا ہے۔ یہ تصوف کا دوسرا نظریہ ہے جو قرآن کے خلاف ہے اور جس نے مسلمانوں کو غارت کیا، اور سائنس اور حصولِ علم سے متنفر کیا۔

آپ جب تصوف کو داخلِ نصاب کریں گے تو بچوں کو باطنی ذرائع سے علم حاصل کرنے کے طریقے بتائیں گے اور بچوں کے حاصل کردہ علم کے نتائج پر مختلف حضرات کو مختلف بچوں کو مختلف حاصل ہوں گے۔ جیسے الہام کی صورت ہے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف حضرات کو مختلف الہام ہوا ہے۔ کسی کو الہام ہوا کہ حضرت امام مہدی شافعی ہوں گے اور کسی کو الہام ہوا کہ وہ حنفی ہوں گے۔

(3) تصوف کا تیسرا خلافِ قرآن عقیدہ تزکیۂ نفس ہے جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پرستش کر کے، اور دنیاوی علائق سے بے تعلق ہو کر روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ تصوف کا نظریہ یہ ہے کہ روحِ انسانی، اللہ تعالیٰ کی ذات کا ایک حصہ تھی۔ اگر اس کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کر دیا جائے تو یہ پھر ذاتِ خداوندی میں جا کر مدغم ہو جائے گی اور ذاتِ باری کا ایک حصہ بن جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف نفس کی پرورش نہیں کرتا، بلکہ وہ نفس کشی کرتا ہے۔ یہ سارا نظریہ ہی قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ایک جوہر ایک صلاحیت عطا ہوئی ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کا حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ ذات کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو صلاحیت ملتی ہے اسے نفس انسانی یا ذاتِ انسانی کہا جاتا ہے، انسان کو یہ ذات غیر نشوونما حالت میں ملتی ہے۔ اس کو نشوونما دینا انسانی زندگی کا مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ مستقل اقدار صرف اسلامی نظام میں جاری ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے ذات کی نشوونما کے لئے اسلامی نظام قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسے تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ جسم کی موت کے واقع ہونے سے ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ زندہ ہی رہتی ہے۔ اگر یہ نفسِ انسانی نشوونما یافتہ ہوگئی تو یہ زندگی کے بلند درجہ میں داخل ہو جاتی ہے اور یہ جنت میں جانا کہلاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ذات غیر نشوونما یافتہ ہوتی ہے۔ تو یہ اگلے درجہ پر بلند نہیں ہوتی وہ اسی درجہ میں رہتی ہے اور یہ جہنم میں رہنا کہلاتا ہے۔ خاتم النبیین رسول اللہ ﷺ نے کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کے علاوہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس میں مستقل اقدار جاری تھیں اور جس پر عمل کرنے سے ہر شہری کی نفس کا ازخود تزکیہ ہوتا جا رہا تھا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے کائنات کی قوتوں کو تسخیر کر کے، ان سے انسانیت کی خدمت کرنا، یا ان کو فائدہ پہنچانے سے بھی تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ تصوف کے طریق پر تزکیۂ نفس سے انسان خود بھی تباہ ہوتا ہے اور قوم کو بھی تباہ کرتا ہے۔

(4) تصوف کا چوتھا نظریہ جو قرآن کے خلاف ہے وہ ان کی دنیا بیزاری، دنیا میں غلبہ حاصل کرنے سے تنفر، انکساری، فروتنی، رہبانیت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو قوم ایمان لائے گی اور صالح اعمال کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو اس زمین پر اقتدار عنایت فرمائے گا۔ آیۂ کریمہ میں فی الارض کے الفاظ استعمال کر کے روحانی اقتدار کی تردید کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے برعکس صوفیوں کو اقتدار نہیں مل سکتا جو صوفی یا راہب اقتدار کا خواہشمند ہو وہ صحیح معنی میں صوفی نہیں۔ تصوف کی تمام ریاضتیں بھی اقتدار نہیں دلا سکتیں۔ صوفیوں کا ہر جگہ اور ساری تاریخ میں مغلوب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ نہ اُن کا ایمان درست ہے اور نہ ہی ان کے اعمالِ صالح ہوتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ساری انسانیت کی نگرانی کرنا ہے (2:143)، ان کی خدمت کرنا ہے (3:114) اس کے علاوہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) ترجمہ: تم ہو بہتر تمام امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں، حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے۔ اس طرح کی بیشمار آیات موجود ہیں جن پر عمل صرف اقتدار حاصل ہونے کے بعد ہی ہوسکتا ہے اور ان آیات پر عمل کرنے سے تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس صرف قرآن کی اطاعت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اللہ کی عبادت سے منہ موڑنے، اس کی عبادت سے استکبار کرنے سے دنیا میں بھی ذلت ملتی ہے اور آخرت میں بھی ذلت۔ مسلمانوں کو اس زوال سے نکالنے کا واحد طریقہ عبادت خداوندی کرنا ہے۔ اگر مسلمان پرستش کرنا بالکل ترک کر دیں اور انسانوں کی محکومیت کی بجائے اللہ کی محکومیت اختیار کر لیں تو انہیں عروج اور عزت مل جائے گی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (40:60) ترجمہ: بیشک جو لوگ میری محکومی سے تکبر کرتے ہیں، وہ دوزخ میں داخل ہوں گے ذلیل ہو کر۔ یہ آیت مسلمانوں کو تباہی سے بچانے کی کنجی ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں ایک اہم لفظ ''عبادتی'' استعمال ہوا ہے۔ ہمارے علماء کرام عبادت کا ترجمہ پرستش اور بندگی کرتے ہیں جو دونوں ترجمے غلط ہیں۔ بڑے درد اور غم کے ساتھ یہ بات تحریر کی جا رہی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے عبادت کا ترجمہ ''پوجنا'' کیا ہے۔ ملاحظہ ہو 39:66، 39:14، 39:17، 43:45، 43:81 اور دیگر بیشمار آیات، حضرت شیخ الہند عربی ادب کے امام تھے، یہ نہیں ہوسکتا کہ اُنہیں عبادت کے قرآنی معنی یعنی محکومیت معلوم نہ ہوں۔ بلکہ انہوں نے عبادت کا ترجمہ ''پوجنا'' تصوف کے زیر اثر کیا ہے جس کا آج ساری دنیا کے مسلمان خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے عبادت کا لفظ محکومی کے معنی میں استعمال کیا ہے اور حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی جائز قرار دی ہے۔ ہم اپنے موقف کی تائید میں آیات کریمہ و مضامین تحریر کر چکے ہیں۔ ہمارا ایک کتابچہ ''مسلمانوں کے زوال میں پرستش کا کردار'' ہے جو ہماری ویب سائٹ پر بھی پڑا ہے ہم یہ اقتباس اسی کتابچہ سے مقتبس کر رہے ہیں۔

(1) سورۂ بقرہ میں، قصاص کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178) یعنی قصاص میں بڑے چھوٹے، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی آزاد کے مارنے میں آزاد کو ہی قتل کیا جائے گا اور غلام کے بدلے غلام۔ اس آیۂ کریمہ میں قرآنِ کریم العبد کو الحر کے مقابلے میں لایا ہے۔ الحر آزاد ہوتا ہے اور العبد غلام ہوتا ہے وہ اپنے مالک کی پرستش نہیں کرتا۔ صرف غلامی اور اطاعت کرتا ہے۔

(2) سورۂ النحل میں العبد کی تعریف Definition اس سے بھی واضح طور پر کی گئی ہے جبکہ ارشاد ہوتا ہے: عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ (16:75) ترجمہ: بندہ پرایا مال کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا (شیخ الہند) اس آیت میں پھر ان نے العبد کی یہ تعریف کی ہے کہ عبد وہ ہوتا ہے جو دوسرے کا مال ہوتا ہے۔ اپنے پر بھی کسی طرح کی قدرت نہیں رکھتا۔ ہر ایک تصرف میں مالک کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے۔ مالک کی اجازت کے بغیر سب تصرفات غیر معتبر ہوتے ہیں۔ اس کو تو اپنی جان تک پر تصرف واختیار نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی غلام اپنے مالک کی پرستش نہیں کرتا۔ اس لئے عبادت کے بنیادی معنی میں پرستش کا کوئی تصور دور دور تک نہیں ہوتا۔

(3) حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہم السلام نے فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی تو اس نے اس دعوت کو مسترد کر دیا اور اس دعوت کا مذاق اُڑایا اور کہا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت تسلیم کرلیں جو ہمارے محکوم ہیں۔ چنانچہ اس جگہ قرآنِ کریم نے محکوم کے لئے عابد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47) ترجمہ انہوں نے کہا کیا ہم ان دو اپنے جیسے آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ اس آیت نے عابد کے معنی واضح کر دیے کیونکہ بنو اسرائیل قومِ فرعون کی پرستش نہیں کرتی تھی، صرف اس کی محکوم تھی۔

(4) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے ہی ایک دوسری آیت اس موضوع سے متعلق ہے جبکہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنے احسانات یاد دلائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طنزاً جواب میں فرمایا: وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26:22) ترجمہ: کیا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کا تم مجھ پر احسان رکھ رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ غور فرمائیں یہاں اس آیت میں عبدت کس طرح محکومیت کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ اور پرستش کے تصور کی تردید کر رہا ہے۔

(5) سورۂ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ: حکومت اللہ کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہوسکتی اس کے بعد اسی آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا: اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ اس ایک ہی آیت میں قرآنِ کریم نے محکومیت اور عبادت کے الفاظ کو ایک ہی معنی میں استعمال کر دیا ہے کہ عبادت کے معنی پرستش کے نہیں میں بلکہ محکومیت کے ہیں۔

عبادت کے درست قرآنی معنی۔ محکومیت کو پیش نظر رکھ کر اب آپ ایک دوسری آیت کا صحیح قرآنی مفہوم غور فرمائیں اور

یہ بھی غور فرمائیں کہ کس طرح صرف ایک لفظ عبادت کے غلط مفہوم نے قرآنِ کریم کی پوری تعلیم کو بدل کے رکھ دیا ہے ارشاد عالی ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (51:56)، حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی اپنی بندگی کو۔ علماء کرام عموماً عبادت کا ترجمہ بندگی کرتے ہیں کیونکہ بندگی کے معنی ہندی زبان میں پرستش کرنے کے ہیں اور فارسی زبان میں اس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں۔ لیکن علماء اس سے پرستش مراد لیتے ہیں اور یہ سب کچھ تصوف کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ تصوف میں محکومیت خداوندی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ہم نے اوپر بہت تفصیل سے تحریر کر دیا ہے کہ عبادت کے معنی محکومی کے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس آیت کا درست ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم نے جن وانس کو اپنی محکومیت کے لئے پیدا کیا ہے۔ عبادت کا ترجمہ پرستش کرنے سے ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ پرستش دن کے کچھ حصہ میں ہوسکتی ہے۔ دن کے پورے 24 گھنٹے میں پرستش نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا پرستش کرنے کے وقت کے علاوہ جو کام بھی کیا جائے گا۔ وجہ تخلیق کے علاوہ ہوگا۔ قرآنِ کریم میں ارشاد عالی ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (8:60) اور (مسلمانو) ان کفار کے (مقابلہ کے) واسطے جہاں تک ہوسکے، قوت، بندھے گھوڑے جمع کرو اور اس سے اپنے اور خدا کے دشمنوں کو ڈرائے رکھو۔ یہ حکمِ خداوندی ہے۔ اس حکم کی اطاعت وتعمیل کرنا بھی عبادتِ خداوندی ہے۔ لیکن ہمارے علماء وصوفیاء کے ترجمہ کے مطابق یہ عمل مقصدِ تخلیق کے مطابق نہیں ہوگا۔ ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ جو فوج صوفیائے کرام اور علماء عظام پر مشتمل ہوگی اس کا اللہ ہی حافظ ہے ان کے ہاتھوں میں تو تسبیح ہوتی ہے۔ ٹینک چلانا ان کے بس کی بات نہیں۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13)، ساری کائنات تمہارے لئے مسخر کر دی گئی ہے۔ تم کائنات کی قوتوں کو اپنے قابو میں لاؤ، اور ان قوتوں سے انسانیت کو فائدہ پہچاؤ۔ اسی سے تزکیہ نفس ہوتا جاتا ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ صوفی صاحب اپنے حجرہ میں بیٹھے ہیں اور وِرد و وظائف کر رہے ہیں۔

انسان کے لئے دوسرے انسان کی محکومی اختیار کرنا وجہ تذلیل انسانیت ہے۔ غیر اسلامی نظام میں عمداً زندگی بسر کرنے والا مجرم ہوتا ہے (6:123) وہ کافر ظالم اور فاسق ہوتا ہے (44، 45، 5:47) اس کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے (4:97)۔

چونکہ اسلامی مملکت میں قرآنِ کریم کے قوانین نافذ ہوتے ہیں اس لئے اسلامی مملکت کی اطاعت قرآنی قوانین کی اطاعت ہوتی ہے یہ ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اس مملکت کے Revenues ادا کرنا، مختلف Taxes ادا کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا ہوتی ہے۔ کسی چوراہے پر سپاہی کے اشارے کی اطاعت کرنا، عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اس مملکت میں پرستش کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اس مملکت کی عدالتیں، تھانے، تحصیلیں سب مساجد اللہ ہوتی ہیں کیونکہ یہاں سے قوانینِ خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ تصوف میں نجات کا ذریعہ پرستش ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری رائے میں تصوف اقامتِ دین میں ایک رکاوٹ ہے اور اس پر عمل کرنے والے حضرات پر قرآنِ کریم ان جرائم کا حکم لگاتا ہے جو ابھی اوپر تحریر کر دیے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

وعدہ پورا کرو

آفاق نے دوپہر کو کچھ دیر آرام کرنے کے بعد غسل خانے کا رخ کیا۔ نہایا دھویا اور صاف کپڑے پہنے۔ آج قیصر نے اس کے ہاں آنے کا وعدہ کر رکھا تھا اس لئے آفاق کو اپنے دوست کے آنے کے خیال سے بہت خوشی ہو رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں بہت سی باتیں اس کے ساتھ کرنے کو سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی امی سے کہہ کر تین چار چیزیں کھانے کے لئے منگوائیں اور خود برآمدے میں اپنے دوست کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑی باندھ رکھی تھی۔ قیصر نے پانچ بجے آنے کا کہا تھا۔ بس پانچ منٹ باقی تھے۔ آفاق ایک نظر گھڑی پر ڈالتا تو دوسری نظر اس کی سامنے سڑک پر جاتی کہ اب قیصر آیا کہ آیا۔ پانچ منٹ گزر گئے مگر ابھی قیصر نہیں پہنچا تھا۔ خیر دو تین منٹ تو اوپر ہو ہی جایا کرتے ہیں، آفاق نے سوچا اور نظریں سامنے ڈالے کرسی پر بیٹھا رہا۔ مگر پانچ منٹ اور گزر گئے۔ گھڑی کی سوئی اپنی رفتار سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اب آفاق کو کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔

وہ سوچنے لگا: ”قیصر کیوں نہیں آیا۔ اسے اب تک آجانا چاہئے تھا۔ اس نے پانچ بجے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔۔۔ خیر ابھی آجائے گا۔ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ کوئی وجہ ہوگئی ہوگی جو یہ دیر ہوئی۔“

آفاق اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اپنا دل بہلانے لگا۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ اب آفاق گھر کے باہر نکل آیا۔۔ شاید دور سڑک سے قیصر آتا ہوا نظر آجائے مگر قیصر کا تو کہیں دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ بے چارہ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

انتظار کی حالت بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ آفاق نے اندر باہر کئی چکر لگا ڈالے۔ وقت گزرتا گیا اور پانچ سے چھ بج گئے۔ آفاق نے کتنے شوق سے کھانے پینے کی یہ سب چیزیں منگوائی تھیں۔ خیال تھا کہ دونوں دوست اکٹھے مل کر کھائیں گے تو بہت لطف آئے گا مگر قیصر نے تو حد ہی کر دی۔ سب کچھ غارت ہو گیا۔

اب آفاق کو غصہ آ گیا تھا۔ اچھا دوست ہے، وعدہ کیا اور پورا نہ کیا اور میں اس کے انتظار میں خوار ہو رہا ہوں۔ چھوٹی بہنوں جویریہ اور ماریہ نے سیر پر جاتے ہوئے کئی بار کہا کہ ساتھ چلو لیکن میں نہ گیا اور ابا جان کو جانا پڑا۔ قیصر نہ تو خود آیا نہ ہی کوئی اطلاع دی کہ میں فلاں وجہ سے نہیں آسکوں گا۔ آفاق اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔

اِدھر اس کی امی کو بھی پتہ چل گیا کہ آفاق کا دوست نہیں آیا۔ وہ اس کے پاس آ گئیں اور پوچھنے لگیں:

''کیا قیصر نے اپنے نہ آسکنے کی کوئی اطلاع بھجوائی ہے؟''

آفاق غصہ سے بولا:

''امی جان، اطلاع کہاں! مجھے قیصر پر بہت غصہ آ رہا ہے۔ اس نے سکول میں مجھ سے پکا وعدہ کیا کہ میں ضرور آؤں گا اور اب نہیں آیا۔۔ میں اب کبھی اس کے وعدے پر اعتبار نہ کروں گا۔''

امی بولیں: ''بیٹا! یہ تو ٹھیک ہے کہ قیصر نے وعدہ توڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اگر اس کے یہاں آنے میں کوئی رکاوٹ پڑ گئی تھی تو تمہیں اس کی اطلاع ضرور دیتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وعدے کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں یا اس کو یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ وعدہ پورا کرنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔''

''اور کیا؟ امی جان!'' آفاق بولا۔

امی بولیں:

''آفاق بیٹے! تمہیں اس پر ناراض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو تمہارا فرض یہ ہے کہ اپنے دوست کو بڑی نرمی اور ہمدردی کے ساتھ بتاؤ کہ کسی کے ساتھ جب کوئی وعدہ کرو تو اس کو ہر حالت میں پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے کہ وعدہ کی پابندی کرو۔ تمہارا دوست جب یہ بات سمجھ جائے گا تو اُمید ہے کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس طرح تم دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

آفاق نے اپنی امی کی بات پر دھیان دیتے ہوئے جواب دیا: ''اچھا امی جان! میں اپنے دوست کو وعدے کا پابند بنانے میں مدد دوں گا۔''

''شاباش بیٹا شاباش! یہ ہوئی نا بات!'' امی نے آفاق کو پیار سے کہا۔

ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اُڑنے چگنے میں دن گذارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سُن کر بلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(علامہ محمد اقبالؒ)

Tolue Islam, Quran and Hadeeth

Dr Ejaz Rasool, UK

I had translated the book by Allama Parwez titled *The Status of Hadeeth in Islam* sometimes back (2016). In the last chapter of the book Allama Parwez had noted his answer to a reader in great detail. The reader had proposed that why does he (Parwez) not compile a collection of Ahadeeth himself which he may consider those which are compatible with the Quran. Allama Parwez had in reply noted that he can never do this task because in that case it will mean that Rasul-ullah ﷺ should have done this task but since he could not do this or never felt a need for it and now Parwez should accomplish this task which either Rasul-ullah did not do or did not feel the need to do it.[1]

This is an important point for those who have acquired the Quranic understanding that why did Rasul-ullah not feel a need to leave some additional writings over and above the Quran – the answer for this is contained within the Quran.

Firstly, over here one more important clarification is required. We often read that there are many Ahadeeth which are weak (*Wad'ee*) but despite this we are unwilling to take these out of the books of Ahadeeth and these are still continuing to be read and quoted just like those which are considered non-*Wad'ee* (i.e. accurate) and these are made part of the belief system. I will not use the term Eimaan here because in this way the differentiation would be kept between the Quranic Eimaan and the religious belief system. There is a great harm of following this path, because when we state that Tolue Islam is not in favour of weak Ahadeeth, then it means that those Ahadeeth which are not weak and do not differ with the Quran then we acknowledge these to be correct? We have seen that some of these Ahadeeth are quoted in some issues of the journal of Tolue Islam and it is said that these can possibly be of Rasul-ullah. From this we are telling those who have beliefs in these Ahadeeth that two hundred plus years after the death of Rasul-ullah the sayings which were compiled and which were then attributed to him by these compilers could possibly be the sayings of Rasul-ullah?

This is that point which in my opinion is needed to be resolved and needs our careful reflection in the light of the Quran. The Quran has clearly stated about itself that:

1. It is a complete book of guidance for mankind till the last day on this planet and Deen is presented in complete form in it (5:4).
2. Since it is a complete book and it is also preserved (15:9), hence there

[1] G. A. Parwez, *The Status of Hadeeth in Islam*, p 191

remains no need for any other *Wahi* after the Quran. In other words, the Quran has declared to us that it is completed and for this it provides the evidence as well.

3. Since the book is completed as a guidance for mankind and meets all the needs of guidance, hence, there remains no need for further arrival of a *Nabi* and a *Rasul*.
4. Since Rasul-ullah had comprehended the Quranic Wahi and acted on it the way the Quran guides, hence, he never felt the need other than it for any other source of guidance to establish the system of Deen. He by acting on it demonstrated practically to all that when we follow the Quran we become deserving of Allah's help in the system of Deen which is explained and promised within it.
5. It means that the Quran proved to Rasul-ullah that since it is a complete code of life, hence there is no need to leave anything else for the Ummah other than the Quran. This also means that if Rasul-ullah being human could get those results by following it then those coming after him can get the same results as he and his companions (Sahaba) achieved in their era.
6. Since Quran is based on Al-Haqq and Wahi informs us about those facts right on the first day, hence, no part of the Quran can be produced by the human intellect because human consciousness and intellect cannot think outside the sphere of its own emotions, desires and intellect.
7. When the Quran states that it explains itself then we can through cross referencing check the meanings of the verses. Allama Parwez has explained this technique in his writings in detail.
8. The Quran has stated with evidence that due to the finitude of the sphere of the human intellect the human problems will arise in the world. The human intellect will not be able to resolve these problems at a global level due to human emotions and desires, therefore it will require the guidance of Wahi. With this, it has also clarified that if human system will be based on the values of Deen then the results will be positive and this world will become a paradise on the earth. And since this system of Deen will cater for all the needs of human life hence, this will meet the physical needs as well as the needs of the human self. This also means that the system will help to contribute to the development of the human self (those who choose) for the life of the hereafter.
9. The Quran has stated repeatedly that in order to benefit from its guidance accepting Eimaan is a pre-requisite e.g. (2:177). It has stated five constituents of this process of acquiring Eimaan and together with this it has noted that if Eimaan sets in then the understanding of the Aa'maal e Saleh will follow and through these deeds the self created based on this Eimaan will start developing. This is the beginning of a new life within a Momin and

as a consequence of this these Momineen will feel the need for the system of Deen – this is inbuilt in this process of acquiring Eimaan.

10. This means that without accepting Eimaan (2:256) that teaching of the Quran cannot be comprehended which is required for the establishment of Deen in the human world. This is the reason that those people who have not yet acquired such Eimaan as explained by the Quran, they do not feel the need for the establishment of a system of Deen.

These are some points which I could think of to support my line of thinking in this article. Over and above these points the Quran has also brought other issues related to the system of Deen to our attention. But for this article and discussion these are enough. We know that nowhere the Quran has called itself inadequate or incomplete and together with this it has provided enough freedom of action so that we can plan and form a system according to the needs of our time. If required, we can formulate sub clauses within its value system which may be needed through consultation between those Momineen who are of a very high fidelity and eminence (selection to be based on the criteria given by the Quran).

If we wish to establish a system of Deen then we will need the following:

(1) Those Momineen who after acquiring Eimaan understand the system of Deen ideologically very well. They should know the functioning of the Law of Requital completely that how it operates in the human world and in this there is not an iota of their own desires and emotions. They voluntarily become ready on the agreement to hand over their 'possessions and life' to Allah so that the system of Deen could be established.

(2) There will be a need of the books of Allama Parwez so that these could be used as references, but decisions will be through mutual consultations.

(3) We will not need any literature from the past. The Quran will be consulted in a way as if we received this Wahi as of today. All the literature which is available in the market in the name of Islam, will not be required.

(4) Whatever level the human knowledge has reached in today's world, we will need to move forward from here and the system of Deen will need to be shaped accordingly. Therefore, we will need to be fully aware of the problems of today's world because this is our starting point. The religion will have no relationship with this. The religion is like a virus in Deen hence life cannot emerge out of it. This will fall under the domain of 'La'. Hence, no religious person will be allowed anywhere near the planning, organisation and execution of Deen i.e. for introducing Deen and then to establish it.

(5) No such customs and practices will be allowed to interfere in Deen as these will slow it down – we cannot even think of coming closer to these. Since human beings have to have complete freedom within the system of Deen, hence every practice and ritual which creates fear will be eliminated – of

course the Hikmat for this will be explained from the Quran.

(6) Every value of the Quran and the Divine attribute will need to be kept before us with this in view that if any disobedience and transgression occurred even unwittingly, then that consequent loss and harm will be highly risky. In this system nothing will ever be done in reference to any personality; decisions will be taken by the mutual consultation of Jamaat e Momineen without taking into consideration what occurred in the past.

These are some comments which I have noted down based on my understanding. Before me there are two important matters:

a. The Islamic System of the state which was established at the time of Rasul-ullah, what was the cause for its decline and it is obvious that it was moving away from the Quranic teaching and its values. Whether this was done deliberately or due to ignorance and incompetence, the Law of Requital manifested its results.

b. After that, despite the lapse of thirteen centuries this system could not be established. Is it because Allah did not help Muslims or whether that kind of Muslims never emerged who never developed their selfs in the light of the Quranic teaching to that minimum threshold because of which they could become deserving of Allah's help? Or they never grasped this point that this is not a name given to a mechanistic act of life. This is an ideological matter in which those who wish to establish the Islamic System need to comprehend the Quran without any outside contamination exactly the way Allah used to guide his Nabi and Rasul and take him forward i.e. this guidance of Allah is still available to us but now we have to voluntarily advance forward in order to benefit from it. Allah and His Quran are waiting for these Momineen with a view to offer the required help.

Now with this brief discussion, we return to that question that if any Hadeeth which appears in line with the Quran or does not contradict or differ with it, can we accept it as being from Rasul-ullah? My answer to this question is a big NO. If that Hadeeth is presented as a saying of some human being then we can make a decision after understanding it whether it is acceptable in the light of the Quran or not as we always do in the case of statements made by different people e.g. on the media, by various politicians, etc. But if it is presented to us saying this is what Rasul-ullah had stated or may have stated then this is a lie because Rasul-ullah never left behind anything in writing except the Quran. As stated earlier the evidence is the Quran itself – he never needed to leave anything behind as we have also figured it out that the Quran is a complete book of guidance. We also reach the same conclusion just like Hazrat Umer (RA) that '*Hasbo na Kitabullah*' i.e. The Book of Allah is sufficient for us. According to my understanding this should be the stance of Tolue Islam – we must not compromise between Al-Haqq and Batil.

.This stance is also essential because if we will bring forward those Momineen who have ideologically strong Eimaan then there is a strong hope that at some point in the future there may appear favourable circumstances and humanity in some part of the world may come to Deen. Then these Momineen will accept this challenge with a solid foundation of the understanding of Deen of the Quran – pure complete Quran. Following will define their consciousness:

(a) Since they would have accepted Eimaan on the pattern suggested by the Quran, hence in their consciousness there will only be the model of Allah's attributes as mentioned in the Quran. They will have complete knowledge within their consciousness that this newly created self they could only acquire through the Eimaan according to the Quran. This will give birth to a new way of thinking and to a new life. The expanse of their consciousness would have expanded where they could see the human life linking with the life of the hereafter and would think of the consequences of their actions now on the future of Deen and the system.

(b) Since their inner reality would have attained new life, hence they will be fully aware of the human problems around them. They would not see every human being as only a physical entity but will see them holistically including their inner self and its potentials. The solution of their problems and issues of life will be resolved as if these are their own issues and they will take 100% advantage from the Quranic teaching. This will form part of their Eimaan, and the fact that this system of Deen has to be established in the world. That Al-Haqq has to overcome Batil and that the creation of Allah is based on Al-Haqq (45:22).

(c) Since they have complete knowledge and evidence based on their own vision about the functioning of the Law of Requital, therefore they will know that longer this system of Deen takes to establish itself, the longer humanity will suffer under the burden of these hardships created by the man-made systems. As they would have had the experience of the non-Deen system hence they will always be aware of this fact that if some wrong step is taken, it could bring the injustice back as a system

(d) In all these efforts they will never do it mechanically, but instead do it with the full willingness of their heart and mind i.e. consciousness. In this task assigned by Allah since they will be His companions, therefore despair and frustration will not come anywhere near them (Eimaan and Iblees can never co-exist). They will hold the rope of Allah firmly and advance ahead with steadfastness and fortitude. In this they will keep checking the signposts in the light of the Quran and by recognising the milestones on the straight path would steadily tread forward on the strength of their Eimaan. Through Aa'maal e Saleh this tree of Deen will be made stronger and stronger. For the

future, children will be helped to become Momineen through education and training based on the Quran who can take this system of Deen forward and they should have the ability and capacity to counter the opposing forces so that this system is not weakened like the earlier era.

Now at the end some suggestions are noted for Tolue Islam:

(i) We need to present only the Quranic teaching and guidance – that teaching through which Deen could be understood from individual to a collective system

(ii) We should make efforts to avoid presenting and quoting any Hadeeth literature (unless it is unavoidable e.g. to discuss some issue) nor we need to get into any argument. For us Allah's book is enough. If public is happy to keep their beliefs based on teachings outside the sphere of the Quran, then we do not need to make any comments – it is their 'deen'. It is up to any individual to make his decision as to what kind of life he wishes to spend with what belief.

(iii) We do not need to forward this explanation that what is the historical status of Ahadeeth. As and when this issue comes before us we should firmly state this that the human problems cannot be solved without coming exclusively to the Quran. If people think they can do it, they should keep trying, ultimately mankind will have to come to the Quran.

(iv) The Law of Requital needs to be brought before people repeatedly (45:22) so that it embeds in the minds of all members and well wishers of Tolue Islam that without understanding this law the system of Deen cannot be comprehended – and if something is not comprehended intellectually then it can never be established.

Finally, I would like to remind ourselves that to include any other thought in the Quranic thought is Shirk and those who have such a consciousness can never ever bring Deen into shape or in other words they can never get Allah's help. Without Allah's help the system of Deen can never take birth and hence cannot be established. Hence those of us who wish to bring the system of Deen in the world to replace the man-made system they need to reflect on the points noted in this article and read through those parts of the books of Allama Parwez which deal with the issues of the human self's development and the establishment of Deen.

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

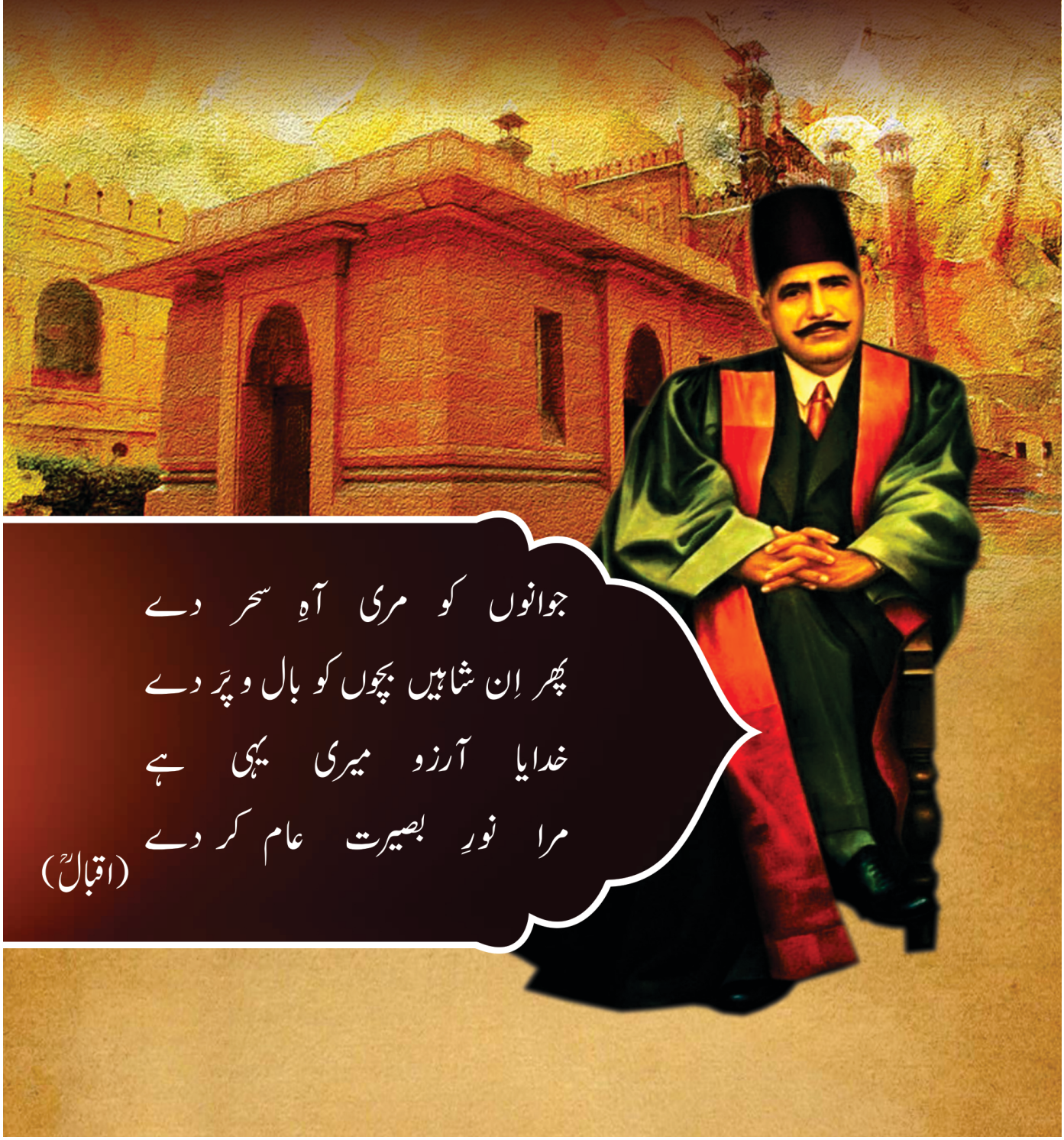

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر اِن شاہیں بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

(اقبالؒ)